جلد ۸۴ — جنوری ۱۹۷۶ء — عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

تفہیم القرآن

کے

نئے ایڈیشن

طبع ہو کر آ گئے ہیں۔ قارئین کرام واجینٹ حضرات آج ہی اپنے آرڈر سے

مطلع فرمائیں

ہدیہ تفہیم القرآن جلد دوم	-/۴۲ روپے
〃 جلد سوم	-/۴۵ 〃
〃 جلد پنجم	-/۳۸ 〃
〃 جلد ششم	-/۳۸ 〃

ادارہ ترجمان القرآن - اچھرہ - لاہور

فون نمبر ——— ۴۱۱۰۱۶ ، ۴۱۱۰۱۷

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۴	جنوری ۱۹۷۶ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۹۵ھ	عدد ۵

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵- اے ذیلدار پارک ، اچھرہ - لاہور

زرِ سالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۱/۲۵ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جس طرح کسی شخص کے جسمانی ڈھانچے کا زیادہ تر مدار ریڑھ کی ہڈی پر ہوتا ہے بالکل اسی طرح کسی معاشرہ کا نظم اُس کے اجتماعی اخلاق سے تشکیل پاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لوگوں کا انفرادی اخلاق بھی معاشرہ کی اخلاقی صحت کو برقرار رکھنے میں خاصی اہمیت رکھتا ہے لیکن جس اندازِ فکر کو لوگ اجتماعی شعور کے نام سے جانتے ہیں، وہ درحقیقت کسی معاشرے اور قوم کی عظمت اور برتری کا ضامن ہوتا ہے۔

آپ اگر معاشرہ کے اندر چل پھر کر لوگوں کے خیالات کا جائزہ لیں تو آپ کو یہ جملہ اکثر زبانوں سے ادا ہوتا سُنائی دے گا: "لوگ نیک اور اچھے ہو جائیں تو حکومت خود بخود اچھی ہو جائے گی"۔ عوام تو ایک طرف رہے بسا اوقات پڑھے لکھے لوگ بھی اسی رائے کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور انسان حیرت زدہ ہو کر یہ سوچتا ہے کہ جس ملک میں لوگ اجتماعیت کی اہمیت اور اس کے ہمہ گیر اثرات سے اس حد تک ناواقف ہوں، اس ملک کا مستقبل کیا ہو سکتا ہے۔ اس انداز پر سوچنے والے غالباً معاشرہ کے افراد کو اینٹوں پر قیاس کر کے یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اگر اینٹیں پکی ہوں تو جو عمارت بھی ان سے تیار کی جائے گی وہ بھی لازمی طور پر مستحکم ہو گی۔ یہ طرزِ استدلال دو مفروضات پر قائم ہے۔ ایک یہ کہ اینٹیں تیار کرنے والے بھٹے کا انتظام جس مالک کے ہاتھ میں ہے وہ عمدہ اور پختہ اینٹیں ہی بنانا چاہتا ہے اور دوسرے یہ کہ پختہ اینٹیں لازمی طور پر ایک ایسے ماہرِ فن کے ہاتھ آئیں گی جو ان سے ایک پختہ اور مستحکم عمارت بنانے کا خواہشمند ہو گا۔ لیکن اگر بھٹہ کا مالک ہی بددیانت ہو اور لوگوں کو نیم پختہ اینٹیں ہی فراہم کرنے پر مصر ہو تو پھر ایک عمدہ اور مستحکم عمارت کس طرح معرضِ وجود میں آ سکتی ہے۔ اور بالفرض اگر پختہ اینٹیں بھی فراہم ہو جائیں پھر بھی مستحکم عمارت

کی تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ عمارت تعمیر کرنے والا ان اینٹوں کے ڈھیر میں سے بڑی فراست کے ساتھ اچھی اور پختہ اینٹوں کو منتخب کر کے انہیں اُن کے صحیح مقام پر پیوست کرے۔ اس کے علاوہ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے میں نہ صرف بڑی ہنرمندی اور چابکدستی کا مظاہرہ کرے بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ چپکانے میں جو مسالہ استعمال کیا جائے وہ بھی بڑا عمدہ ہو۔ ان ساری تدابیر سے بڑھ کر ان پکی اینٹوں کی افادیت کا سارا انحصار اس بات پر ہے کہ فنِ تعمیر کا کوئی ماہر نیک عزم کے ساتھ اچھے نقشہ کے مطابق عمارت تعمیر کرنے کی غرض سے انہیں استعمال کرے۔ اگر ماہر فن خدا ترس اور نیک ہو تو وہ ان اینٹوں کی مدد سے مسجد تعمیر کر کے بندگانِ خدا کو اپنے مالک اور خالق کے حضور جھکنے کے لیے نہایت موزوں جگہ فراہم کر سکتا ہے۔ اور اگر ماہر فن کو فسق و فجور سے محبت ہو تو وہ ان پکی اینٹوں سے میکدہ اور بدمعاشی کے دوسرے اڈے تعمیر کرتا ہے۔ پکی اینٹ تعمیر کرنے والے کے ہاتھ میں بالکل بے بس ہوتی ہے۔

بعض لوگ اس طرزِ استدلال کو یہ کہہ کر مسترد کر دیتے ہیں کہ اینٹیں تو بے جان اور بے ارادہ ہوتی ہیں اس لیے انہیں جاندار اور صاحبِ ارادہ انسان پر قیاس کرنا غلط ہے۔ یہ اعتراض بظاہر بڑا وزنی معلوم ہوتا ہے لیکن ان کے اس اعتراض سے یہ حقیقت مزید منکشف ہو جاتی ہے کہ انفرادیت کے یہ علمبردار اجتماعیت کی غیر معمولی طاقت کا اچھی طرح شعور نہیں رکھتے۔ افراد بلاشبہ اینٹوں کی طرح بے شعور اور بے ارادہ نہیں لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کے اندر محض شعور اور ارادہ کی موجودگی انہیں اجتماعی قوتوں کے ہاتھ میں بے بس کھلونا بننے سے محفوظ رکھے۔ انفرادی شعور اور احساس اور انفرادی عزم اور ارادہ نہ تو از خود اجتماعی قوت میں ڈھلتے ہیں اور نہ ان میں خود بخود یہ تحریک پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنے اندر اتنی قوت پیدا کر لیں کہ ہر اس نظریے اور نظام سے ٹکرا جائیں جو ان کے مزاج سے مغائرت رکھتا ہو۔ جس طرح آکسیجن اور ہائیڈروجن کا محض وجود اس بات کی ضمانت نہیں کہ انہیں بہرحال ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہو کر پانی کی صورت میں نمودار ہونا ہے بالکل اسی طرح کسی معاشرہ میں نیک افراد کی موجودگی اس بات کی ضمانت نہیں ہو سکتی کہ معاشرہ کو لازمی طور نیک ہی بننا ہے۔ اگر گیسیں مختلف نوعیتوں کے طبیعیاتی مراحل سے گزر کر ہی پانی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں تو یہ پاکباز اور با اخلاق افراد بعض صبر آزما مراحل سے گزرنے کے بعد ہی ایسی اجتماعی قوت کو جنم دیتے ہیں جس کی مدد سے بھلائی کو فروغ اور برائی کا استیصال ممکن ہوتا ہے اور انفرادی نیکی اور پارسائی کو برومند ہونے کے

پورے مواقع میسر آتے ہیں۔ انفرادی شرافت کی حیثیت معاشرے میں لَو کی سی ہوتی ہے جس سے بلاشبہ دل کا کوئی گوشہ منور ہو جاتا ہے مگر یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ یہ لَو آندھیوں کی زد سے محفوظ رہے لیکن اگر فسق و فجور خوفناک طوفان کی صورت اختیار کرکے کسی معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے لے تو انفرادی پاکبازی کے یہ مدھم اور منتشر دیے آخر کس طرح خوفناک طوفانوں کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ وہ آج نہیں تو کل گُل ہو جائیں گے۔ اس لیے نیکی اور شرافت کی ان قندیلوں کو روشن رکھنے اور ان کی مدد سے معاشرے کو بقعۂ نور بنانے کے لیے دو چیزوں کی اشد ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ خیر اور بھلائی کے یہ چراغ جس تیل سے جل رہے ہیں اس میں کسی طرح کمی نہ آنے پائے۔ دوسرے انہیں آندھیوں کے حملوں سے ہر صورت میں بچایا جائے۔

ہم اسے مسلم قوم کے متعدد تاریخی المیوں میں سے ایک عظیم المیہ سمجھتے ہیں کہ ملّتِ اسلامیہ کے اندر انفرادی نیکی کا شعور اور احساس تو ہر مرحلہ پر کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا ہے لیکن اس نیکی کو اجتماعی قوت بنانے کے احساس میں وہ تسلسل نظر نہیں آتا جس کی اس اُمت سے بجا طور پر توقع کی جاسکتی ہے۔ اس کے کئی ایک وجوہ ہیں جن میں بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود اسلام کے اجتماعی نظام سے کسی مرحلہ پر بھی صریحاً انحراف کی جرات نہیں کی اور اگر کسی دیوانے نے ایسا کیا تو اس کا بڑی پامردی سے مقابلہ کیا گیا۔ اسی بنا پر مصلحینِ اُمت اپنی زیادہ تر توجہ لوگوں کی انفرادی اصلاح پر صرف کرتے رہے ہیں۔ خلافتِ راشدہ کے بعد مسلمانوں پر جو سیاسی نظام مسلط رہا اسے اگرچہ بادشاہت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے لیکن اس بادشاہت نے کسی عہد میں بھی آمریت کی صورت اختیار نہیں کی۔ مسلمانوں میں بہت کم ہی کوئی ایسا فرمانروا پیدا ہوا ہوگا جس نے اپنے سارے جاہ و جلال کے باوجود اپنے آپ کو ان معنوں میں مطلق العنان سمجھا ہو کہ وہ احکامِ شریعت کو پامال کرسکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اپنے غلط اعمال کی کوئی توجیہہ اور تعبیر پیش کر دی لیکن انہیں یہ جسارت کبھی نہیں ہوئی کہ وہ اپنے عزائم اور ارادوں کو شریعت سے بالاتر سمجھیں۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول کے تابع اور شریعت کا خادم ہی ظاہر کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم عوام میں اجتماعی شعور پیدا کرنے کی ماضی میں اشد ضرورت محسوس نہ کی گئی۔

اس کے علاوہ سابقہ ادوار میں ملکی انتظام و انصرام کے جو قوانین اور ضابطے رائج تھے اور جنہیں حکومت

قوت کے زور سے نافذ کرتی تھی وہ اتنے ہمہ گیر نہ تھے کہ پوری معاشرتی زندگی براہ راست ان کی تحویل میں آجاتی اور انفرادی زندگی کا دائرۂ کار یکسر معدوم ہو کر رہ جاتا۔ اُس دور میں حکومت اپنے آپ کو صرف دو کاموں کی ذمہ دار سمجھتی تھی: دفاعِ وطن اور داخلی انتشار سے قوم کا تحفظ۔ ثانی الذکر ذمہ داری میں معاشرے کے اندر عدل و انصاف کا قیام اور معاشی استبداد سے نجات کے فرائض بھی شامل تھے۔ ان چند ذمہ داریوں کے علاوہ حکومت پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوتی تھی۔ اس بنا پر اُمت کے بہی خواہ ملک کے اندر اصلاحِ احوال کے لیے جو کچھ چاہتے بڑی آزادی سے کر سکتے تھے۔ نیک دل بادشاہ تو نیکی اور بھلائی کو پھیلانے کے لیے خود کوشاں ہوتے اور ان تمام افراد اور اداروں کی سرپرستی کرتے جو اس فرض کی انجام دہی میں مصروف ہوتے مگر بگڑے ہوئے فرمانروا بھی عوام کے اندر بگاڑ پیدا کرنے کی جرأت نہ کرتے۔ چنانچہ ان کی آوارہ مزاجی کے بُرے اثرات محلات تک محدود رہتے۔ عوامی زندگی فسق و فجور کی زد میں آنے سے محفوظ رہتی۔

ظاہر بات ہے کہ جس معاشرہ میں حکومت کا دائرہ کار محدود ہو، وہاں انفرادیت کو بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے غیر معمولی مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ اس بنا پر ماضی میں انفرادیت پسندی کے رجحان کو خوب تقویت حاصل ہوئی۔ یورپ میں اس رجحان نے ایک خوفناک قسم کی رہبانیت کو جنم دیا جس سے معاشرتی زندگی تہ و بالا ہو کر رہ گئی۔ خدا سے محبت کرنے والے افراد نے معبودِ حقیقی کی تلاش میں سارے انسانی رشتوں کو خیرباد کہہ کر صحراؤں اور بیابانوں کا رُخ کیا اور وہاں گیان دھیان میں اس حد تک منہمک ہوئے کہ انہیں انسانوں کے حالات کی کوئی خبر نہ رہی۔ معاشرے کے بگڑے ہوئے افراد نے جب یہ دیکھا کہ نیکی اور خدا ترسی اجتماعی زندگی کے سارے گوشوں سے از خود سمٹ کر جنگلوں کی طرف منتقل ہو رہی ہے اور انسانیت اور اس کے معاشرتی، سیاسی اور معاشی مسائل کے ساتھ اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا تو انہوں نے نیکی کے اس خلا سے خوب فائدہ اُٹھایا اور اجتماعی زندگی کو فسق و فجور سے معمور کر دیا۔ مسلم معاشرے میں بلاشبہ تعلق باللہ نے رہبانیت کی ہیبتناک صورت تو کبھی اختیار نہ کی لیکن خارجی اثرات کی وجہ سے اس کے ہاں یہ تاثر ضرور پیدا ہوا کہ خدا سے محبت کرنے والا وہی شخص ہو سکتا ہے جس کا دنیا اور اس کے معاملات سے کوئی تعلق نہ ہو۔ خصوصاً سیاست کو شجر ممنوعہ سمجھ کر اسے اس سے اس طرح دامن کش رہنا چاہیے کہ اس "خبیث درخت" کی پرچھائیں بھی اس پر پڑنے نہ پائیں — چنانچہ مسلم ممالک میں رہبانیت کے یہ رُوح فرسا مناظر تو دکھائی نہیں دیتے کہ لوگ اللہ تعالیٰ سے تعلق استوار

کرنے کی غرض سے لاکھوں کی تعداد میں صحراؤں کا رُخ کر رہے ہیں اور جن لوگوں کے ہاتھ میں اُن کے اجتماعی نظم کی باگ ڈور ہے وہ بڑی آزادی کے ساتھ شہروں کے اندر فسق و فجور پھیلانے میں مصروفِ عمل ہیں اور اس طرح ایک معاشرہ تضاد کا یہ بھیانک نقشہ پیش کر رہا ہے کہ بیابانوں میں تو خدا کی پرستش ہو رہی ہو اور شہروں یعنی تہذیب و تمدّن کے مراکز میں پوری دلجمعی کے ساتھ شیطان پوجا جا رہا ہو۔

تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ خدا اور شیطان کی بیک وقت پرستش اور اس سے پیدا ہونے والی ہولناکیوں سے مسلم معاشرہ کافی حد تک محفوظ رہا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ خیال کسی نہ کسی صورت میں جاگزیں رہا ہے کہ مسندِ اقتدار "دنیاداری" کا سب سے بڑا مظہر ہے اور اس کے حصول کی جدوجہد صرف ان لوگوں کو زیب دیتی ہے جو خدا سے اپنا تعلق توڑ چکے ہوں۔ جن حضرات کو حق تعالیٰ کی قربت کی آرزو ہے انہیں بُرائی کے اس مرکز سے دُور ہی رہنا چاہیے۔

مسلم معاشرے کے خدا ترس اور نیک افراد کی سیاست کے بارے میں اور خاص طور پر مسندِ اقتدار کے متعلق خوف کی سی کیفیت کی ایک وجہ وہ عظیم ذمہ داری بھی ہے جو اسلام مسلمان حکمرانوں پر عائد کرتا ہے قرآنِ مجید اور احادیثِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں جس انداز سے اقتدار کی آزمائشوں کا ذکر ملتا ہے ان کے تصوّر سے انسان کانپ اُٹھتا ہے۔ مسندِ اقتدار کا خیال آنے کے ساتھ ہی یہ خیال بھی اس کے ذہن میں آتا ہے کہ وہ کند چھری سے ذبح کیا جا رہا ہے۔

علاوہ ازیں اپنے خالق و مالک سے ڈرنے والا مسلمان جب بھی اقتدار کے بارے میں سوچتا ہے تو اس کے ذہن میں اُن حکمرانوں کا نقشہ نہیں آتا جو عوام پر اپنی خدائی قائم کرنے کے لیے ان کی گردنوں پر مسلط ہو جاتے ہیں اور حکومت کے وسیع ذرائع و وسائل کو بلا روک ٹوک اپنی عیاشیوں پر صرف کرتے ہیں۔ ایسے بدقماش حکمران جنھیں عوام کی فلاح و بہبود کی تو کوئی فکر نہیں ہوتی بلکہ مسندِ اقتدار پر متمکن ہونے کے بعد انہیں ایک ہی فکر لاحق ہوتی ہے کہ کس طرح اپنے عہدِ اقتدار کو زیادہ سے زیادہ طول دیا جائے اور ملک اور قوم کے وسائل سے جن کے وہ امین بنائے گئے ہیں، اپنی ذات، خاندان کے افراد اور اپنے حاشیہ برداروں کو بھرپور نفع پہنچایا جائے؟ اس قسم کے بگڑے ہوئے حکمرانوں کے لیے کسی مسلمان کے دل میں شدید جذبۂ نفرت

کے علاوہ اور کونسا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اُسے یہ حکمران فرعون، نمرود، شدّاد اور ہامان کے ٹولہ میں شامل نظر آتے ہیں جو خدا کے عذاب کے مستوجب ہیں۔ آخرت پر ایمان رکھنے والا مسلمان جب مسندِ اقتدار پر اس طرح آبرو باختہ لوگوں کو فائز دیکھتا ہے اور قرآنِ مجید اور احادیث میں ان کے لیے دردناک عذاب کی جو وعید آتی ہے اسے سُنتا ہے تو وہ اپنی عافیت اسی میں سمجھتا ہے کہ اس آزمائش سے جس قدر ہو سکے دامن بچایا جائے۔

حکمرانی اور فرمانروائی کے اس گھناؤنے اور بھیانک تصور کے برعکس ایک مسلمان کے ذہن میں عقیدہ اور ایمان کی سی تابندگی کے ساتھ وہ مقدس تصور بھی ہمیشہ موجود رہا ہے جو تاریخ میں "خلافت" کے روشن عنوان کے ساتھ آج تک موجود ہے اور جس تصور نے نہ صرف مسلم قوم کو رہبانیت کے چنگل میں گرفتار ہونے سے بچایا ہے بلکہ پوری نوعِ بشری کو اجتماعی مسائل عدل و انصاف کی بنیاد پر حل کرنے کی دعوت دی ہے۔ خلافت سے انسان نے یہ سبق سیکھا ہے کہ حکومت اور فرمانروائی خدا کی طرف سے ایک مقدس امانت ہے اور اگر اس امانت کا بار خداوند تعالیٰ کی رضا جوئی کی خاطر اور اس کے احکام کے مطابق اُٹھایا جائے تو اس سے اللہ رب العزت کی نظر میں "امین" کا درجہ دوسرے پاکبازوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ بلند ہوتا ہے۔ چنانچہ اجتماعی ذمہ داریوں سے دامن بچا کر زندگی گزارنا خداوند تعالیٰ کے نزدیک کوئی پسندیدہ طرزِ عمل نہیں بلکہ بسا اوقات یہ قابلِ مواخذہ فعل ہے کیونکہ اس میں اس بات کا خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ ملک کی زمام کار فساق و فجار کے ہاتھ میں آجائے جو عوام کو اللہ کے دین سے برگشتہ کرنے میں اپنی توانائیاں اور وسائل صرف کرنے لگیں۔ خلفائے راشدین جس احساسِ ذمہ داری، جس خلوصِ نیت، جس دلسوزی، جس عزم و تدبر اور جس جذبۂ ایثار، جس عدل و انصاف اور جس للّٰہیت کے ساتھ اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوئے اور اللہ اور اس کے رسولؐ نے اُن کی سرگرمیوں کی جس انداز سے مدح فرمائی اُس نے اِس حقیقت کو پوری طرح آشکارا کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کا قرب اجتماعی معاملات میں عدم دلچسپی سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ ان معاملات کو عبادت سمجھ کر سرانجام دینے سے حاصل ہوتا ہے۔ جس طرح انفرادی زندگی میں عائلی اور معاشرتی ذمہ داریوں سے فرار کسی شخص کو اللہ کا محبوب نہیں بنا سکتا بالکل اسی طرح ملک اور قوم کے اجتماعی معاملات سے بے تعلقی کسی فرد یا گروہ کی روحانیت میں اضافے کا باعث نہیں بن سکتی۔ اللہ تعالیٰ آخر اس طرزِ عمل کو کس طرح پسند کر سکتا ہے کہ اس کی مخلوق کو خدا کے خوف سے عاری لوگ ستاتے اور ظلم و ستم کا تختۂ مشق بناتے رہیں اور اللہ کی محبت کا دم بھرنے والے اس ظلم و ستم کے خاموش

تماشائی بن کر نظارہ کرتے رہیں بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول ہی ایک مسلمان کا مطلوب و مقصود ہے لیکن خود خداوند تعالیٰ نے ہی اس مقصد کے حصول کے لیے جو راستہ متعین فرمایا ہے وہ صحراؤں اور بیابانوں میں سے نہیں بلکہ اجتماعی زندگی کے ہنگاموں میں سے گزر کر جاتا ہے۔ دنیا میں آج تک مذہب کی علمبردار جتنی قومیں بھی گزری ہیں ان میں سب سے زیادہ اس راز کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقائے کار نے پایا ہے۔ انہوں نے اپنی مقدس سرگرمیوں کے ذریعے جن کا مقصد رضائے الٰہی کے حصول کے علاوہ اور کچھ نہ تھا پوری انسانیت پر اس راز کو آشکارا کیا کہ اجتماعی زندگی کو اس عدل و انصاف پر قائم کرنا جس پر کہ خالقِ کائنات نے اس کائنات کو پیدا اور قائم کیا ہے، خدا کا قرب حاصل کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔

مسلمان اس راز سے بخوبی واقف ہیں کہ ایک عادل فرمانروا خدا کی نظر میں جس بلند مرتبے اور مقام کا حامل ہے، وہ اُس درویش سے کہیں زیادہ ارفع ہے جو اپنا زیادہ تر وقت اذکار و نوافل میں صرف کرتا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ خدا کے ہاں سب سے زیادہ مستجاب الدعوات سلطانِ عادل ہی ہے اور اس پر رحمتِ خداوندی اس روز خاص طور پر سایہ فگن ہوگی جس دن خدا کے سایے کے علاوہ اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔ ایک مسلمان اس حقیقت سے بھی پوری طرح شناسا ہے کہ اُمتِ مسلمہ میں جو عظمت خلفائے راشدینؓ اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے عمر ثانیؒ اور بعض دوسرے صالح فرمانرواؤں کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے فرد کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ جو شخص مسندِ اقتدار پر فائز ہو کر انسانوں میں اپنی خدائی کا سکہ چلانے کے بجائے خدا کی بادشاہت قائم کرتا ہے اور اس طرح نوعِ انسانی کو اس دنیوی زندگی میں اَرْحَمُ الرّٰحِمِین کی رحمت کے قریب لاتے اور اس سے متمتع ہونے کے مواقع بہم پہنچاتا ہے، وہ کوئی معمولی حکمران تو نہیں ہو سکتا۔ "فقیری میں بھی شاہی" کا طرزِ عمل بلاشبہ ایک پسندیدہ طرزِ عمل ہے کیونکہ یہ کسی انسان کی خدا سے محبت اور دنیا سے بے نیازی کی دلیل ہے لیکن "شاہی میں فقیری" کا سا انداز پہلے طرزِ عمل سے کہیں زیادہ قابلِ احترام اور مستحسن ہے کیونکہ اس میں نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی کا پرتو ملتا ہے۔ جو شخص مال و دولت سے محروم ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اس سے مستغنی سمجھتا ہے وہ یقیناً قابلِ قدر ہے لیکن اُس بلند انسان کی عظمت کا کیا مقام جو تخت و تاج کا مالک ہوتے ہوئے فقیرانہ زندگی بسر کرنا پسند کرتا ہے اور قوم کے وسائل اس احتیاط کے ساتھ (باقی بر صفحہ ۴۷)

اسلام میں انسانی حقوق

(ایک تقریر جو فلیٹیز ہوٹل لاہور میں شہری حقوق اور آزادیوں کے فورم کی دعوت پر ۱۶ نومبر ۱۹۷۵ء کو کی گئی تھی)۔

جناب صدر اور محترم حاضرین و خواتین۔

مجھے "اسلام میں انسانی حقوق" کے موضوع پر آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔ لیکن اس سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ دو باتوں پر اچھی طرح روشنی ڈال دوں تاکہ دوران بحث میں ان کے متعلق کوئی الجھن پیش نہ آئے۔

مغرب میں انسانی حقوق کا تصور

اہلِ مغرب کا یہ قاعدہ رہا ہے کہ وہ ہر اچھی چیز کو اپنی طرف منسوب کرتے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ نعمت بس ہمارے ذریعے سے دنیا کو ملی ہے، ورنہ دنیا ان چیزوں سے ناآشنا اور نری جہالت میں مبتلا تھی۔ اب ذرا اسی حقوقِ انسانی کے مسئلے کو دیکھیے۔ بڑے دعووں کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ اس کا تصور لوگوں کو انگلستان کے میگنا کارٹا کے ذریعے سے نصیب ہوا ہے۔ اگرچہ پھر بھی وہ اسلام کے چھ سو برس بعد کی چیز ہے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ سترھویں صدی کے قانون دانوں سے پہلے کسی کے ذہن میں یہ تصور موجود نہ تھا کہ میگنا کارٹا میں ٹرائل بائی جیوری (TRIAL BY JURY) ہیبیس کارپس (HABEAS CORPUS) اور ٹیکس لگانے کے اختیارات پر پارلیمنٹ کے کنٹرول کے حقوق بھی شامل ہیں۔ اگر میگنا کارٹا کے لکھنے والے اس زمانے میں موجود ہوتے تو ان کو سخت حیرت ہوتی کہ میگنا کارٹا میں یہ چیزیں بھی موجود تھیں۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے سترھویں صدی سے پہلے اہلِ مغرب میں حقوقِ انسانی اور حقوقِ شہریت کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔ سترھویں صدی کے بعد بھی ایک مدتِ دراز تک فلسفیوں اور قانونی افکار پیش کرنے والے لوگوں نے تو ضرور اس خیال کو پیش کیا تھا، لیکن عملاً اس تصور کا ثبوت اٹھارھویں صدی کے آخر میں امریکا اور فرانس کے دستوروں اور اعلانات ہی میں ملتا ہے۔ اس کے بعد مختلف ملکوں کے دستوروں میں بنیادی حقوق کا ذکر کیا

ضرور گیا ہے مگر اکثر و بیشتر حالات میں یہی صورت پائی گئی ہے کہ جو حقوق کاغذ پر دیے گئے ہیں وہ زمین پر نہیں دیے گئے۔ موجودہ صدی کے وسط میں اقوامِ متحدہ نے، جس کو اب اقوامِ متفرّقہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا، حقوقِ انسان کا اعلان (UNIVERSAL DECLARATION OF HUMAN RIGHTS) شائع کیا، اور نسل کشی (GENOCIDE) کے خلاف بھی ایک قرارداد منظور کی اور ایک ضابطہ بنایا۔ لیکن آپ سب جانتے ہیں کہ اقوامِ متحدہ کا کوئی ضابطہ بھی ایسا نہیں ہے جو واجب العمل ہو، جس کے پیچھے کوئی طاقت ایسی ہو جو اس کو نافذ کرائے۔ اس کے تمام فیصلوں کے باوجود انسانی حقوق جگہ جگہ پامال ہوئے ہیں اور اقوامِ متحدہ ان کی کوئی روک تھام نہیں کر سکی ہے۔ دنیا میں نسل کشی کا ارتکاب بھی ہو رہا ہے۔ خود آپ کے پڑوسی ملک ہندوستان میں مسلمانوں کی نسل کشی ۴۲ سال سے جاری ہے۔ لیکن اقوامِ متحدہ میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اس کے خلاف کوئی کارروائی کرے۔ اس پر کہیں کسی ملک کے خلاف بھی آج تک کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

اسلام میں انسانی حقوق کی اصل حیثیت

دوسری بات جو میں چاہتا ہوں کہ ابتدا ہی میں اچھی طرح واضح ہو جائے، یہ ہے کہ جب ہم اسلام میں انسانی حقوق کی بات کرتے ہیں تو اس کے معنی دراصل یہ ہوتے ہیں کہ یہ حقوق خدا کے دیے ہوئے ہیں۔ یہ کسی بادشاہ یا کسی مجلس قانون ساز کے دیے ہوئے نہیں ہیں۔ بادشاہوں اور قانون ساز اداروں کے دیے ہوئے حقوق جس طرح دیے جاتے ہیں اسی طرح جب وہ چاہیں واپس بھی لیے جا سکتے ہیں۔ ڈکٹیٹروں کے تسلیم کردہ حقوق کا بھی حال یہ ہے کہ جب چاہیں وہ عطا فرمائیں، جب چاہیں واپس لے لیں اور جب چاہیں علانیہ ان کے خلاف عمل کریں۔ لیکن اسلام میں انسان کے جو حقوق ہیں وہ خدا کے دیے ہوئے ہیں۔ دنیا کی کوئی مجلس قانون ساز اور دنیا کی کوئی حکومت اُن کے اندر ردّ و بدل کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ ان کو واپس لینے یا منسوخ کر دینے کا کوئی حق کسی کو حاصل نہیں ہے۔ یہ نمائشی بنیادی حقوق بھی نہیں ہیں جو کاغذ پر دیے جائیں اور زمین پر چھین لیے جائیں۔ ان کی نوعیت فلسفیانہ افکار کی بھی نہیں ہے جن کے پیچھے کوئی قوتِ نافذہ (SANCTION) نہیں ہوتی۔ اقوامِ متحدہ کے چارٹر اور اعلانات اور قراردادوں کو بھی اُن کے مقابلے میں نہیں لایا جا سکتا۔ کیونکہ وہ کسی پر بھی واجب العمل نہیں ہیں۔ یہ تو دینِ اسلام کا ایک حصہ ہیں۔ ہر مسلمان اِن کو حق تسلیم کرے گا اور ہر اُس حکومت کو انہیں تسلیم کرنا اور نافذ کرنا پڑے گا جو اسلام کی طرف منسوب ہو اور جس کے چلانے والوں کا یہ دعویٰ ہو کہ ہم مسلمان ہیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے اور اُن حقوق کو جو خدا نے دیے ہیں چھینتے ہیں، یا ان میں ترمیم و تنسیخ کرتے ہیں، یا عملاً انہیں پامال کرتے ہیں تو ان کے متعلق قرآن مجید کا صاف فیصلہ یہ ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ

اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ۔ " جو لوگ اللہ کے حکم کے خلاف فیصلہ کریں وہی کافر ہیں۔" اس کے بعد دوسری آیت میں فرمایا فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ - " وہی ظالم ہیں"۔ اور تیسری آیت میں فرمایا فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ " وہی فاسق ہیں"۔ دوسرے الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ اگر وہ خود اپنے افکار اور اپنے فیصلوں کو برحق سمجھتے ہوں اور خدا کے دیے ہوئے احکام کو باطل قرار دیتے ہوں، تو کافر ہیں۔ اور اگر وہ حق تو خدائی احکام ہی کو سمجھتے ہوں مگر اپنے خدا کی دی ہوئی چیز کو جان بوجھ کر رد کرتے اور اپنے فیصلے اس کے خلاف نافذ کرتے ہوں، تو وہ فاسق اور ظالم ہیں۔ فاسق اس کو کہتے ہیں جو اطاعت سے نکل جائے۔ اور ظالم وہ ہے جو حق کے خلاف کام کرے۔ لہٰذا ان کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں ہے۔ یا وہ کفر میں مبتلا ہیں، یا پھر وہ فسق اور ظلم میں مبتلا ہیں۔ بہرحال جو حقوق اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیے ہیں وہ دائمی اور مستقل ہیں، اٹل ہیں، ان کے اندر کسی ردّ و بدل اور کسی ترمیم و تنسیخ کی گنجائش نہیں ہے۔

یہ دو باتیں اچھی طرح ذہن میں رکھ کر اب دیکھیے کہ اسلام انسانی حقوق کا کیا تصور پیش کرتا ہے۔

خالص انسانی حقوق

انسان بحیثیت انسان کے حقوق سب سے پہلی چیز جو اس مسئلے میں ہمیں اسلام کے اندر ملتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام بجائے خود انسان بحیثیتِ انسان کے کچھ حقوق مقرر کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان، خواہ وہ ہمارے اپنے ملک اور وطن کا ہو یا کسی دوسرے ملک اور وطن کا، ہماری قوم کا ہو یا کسی دوسری قوم کا، مومن ہو یا کافر، کسی جنگل کا باشندہ ہو یا کسی صحرا میں پایا جاتا ہو، بہرحال محض انسان ہونے کی حیثیت سے اس کے کچھ حقوق ہیں جن کو ایک مسلمان لازماً ادا کرے گا اور اس کا فرض ہے کہ وہ انہیں ادا کرے۔

۱- زندہ رہنے کا حق ان میں اوّلین چیز زندہ رہنے کا حق، اور انسانی جان کے احترام کا فرض ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا۔ "جس شخص نے کسی ایک انسان کو قتل کیا، بغیر اس کے کہ اس سے کسی جان کا بدلہ لینا ہو، یا وہ زمین میں فساد برپا کرنے کا مجرم ہو، اُس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا"۔ جہاں تک خون کا بدلہ لینے یا فساد فی الارض پر سزا دینے کا سوال ہے اس کا فیصلہ ایک عدالت ہی کر سکتی ہے۔ یا کسی قوم سے جنگ ہو تو ایک باقاعدہ نظامِ حکومت ہی اُس کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ بہرحال کسی فرد کو انفرادی طور پر یہ حق نہیں ہے

کر وہ قصاص لے یا فساد فی الارض کی سزا دے۔ اس لیے ہر انسان پر یہ واجب ہے کہ قتلِ انسان کا ہرگز ارتکاب نہ کرے۔ اگر کسی نے ایک انسان کو قتل کیا تو یہ ایسا ہے جیسے اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔ اسی مضمون کو دوسرے مقامات پر قرآن مجید میں اس طرح دُہرایا گیا ہے کہ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ۔ "کسی جان کو حق کے بغیر قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے"۔ یہاں بھی حرمتِ قتل کو ایسے قتل سے مستثنیٰ کیا گیا ہے جو حق کے ساتھ ہو، اور حق کا فیصلہ بہرحال کوئی عدالتِ مجاز ہی کرے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قتلِ نفس کو شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ قرار دیا ہے۔ اَکْبَرُ الْکَبَائِرِ الْاِشْرَاکُ بِاللّٰهِ وَقَتْلُ النَّفْسِ۔ اِن تمام آیات اور احادیث میں مطلقاً نفس کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو کسی خاص نفس کو مختص نہیں کرتا کہ اس کا مطلب یہ لیا جا سکے کہ اپنی قوم، یا اپنے ملک کے شہری، یا کسی خاص نسل، رنگ یا وطن، یا مذہب کے آدمی کو قتل نہ کیا جائے۔ یہ حکم تمام انسانوں کے بارے میں ہے اور بجائے خود ہر انسانی جان کو ہلاک کرنا حرام کیا گیا ہے۔

جینے کا حق "انسان" کو صرف اسلام نے دیا ہے

اب آپ دیکھیے کہ جو لوگ حقوق انسانی کا نام لیتے ہیں انھوں نے اگر اپنے دستوروں میں یا اعلانات میں کہیں حقوق انسانی کا ذکر کیا ہے تو فی الحقیقت اس میں یہ بات مضمر (IMPLIED) ہوتی ہے کہ یہ حقوق یا تو اُن کے شہریوں کے ہیں، یا پھر وہ ان کو سفید نسل والوں کے لیے مخصوص سمجھتے ہیں۔ جس طرح آسٹریلیا میں انسانوں کا شکار کر کے سفید نسل والوں کے لیے قدیم باشندوں سے زمین خالی کرائی گئی، اور امریکہ میں وہاں کے پُرانے باشندوں کی نسل کُشی کی گئی اور بقیۃ السیف کو مخصوص علاقوں (RESERVATIONS) میں مقید کر دیا گیا، اور افریقہ کے مختلف علاقوں میں گھس کر انسانوں کو جانوروں کی طرح ہلاک کیا گیا، یہ ساری چیزیں اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ انسانی جان کا بحیثیت "انسان" کوئی احترام اُن کے دل میں نہیں ہے۔ اگر کوئی احترام ہے تو اپنی قوم یا اپنے رنگ یا اپنی نسل کی بنیاد پر ہے۔ لیکن اسلام تمام انسانوں کے لیے اس حق کو تسلیم کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص وحشی قبائل سے تعلق رکھتا ہے تو اس کو بھی اسلام انسان ہی سمجھتا ہے۔

۲۔ حفاظتِ جان کا حق

قرآن مجید کی جو آیت میں نے ابھی تلاوت کی ہے اس کے معاً بعد یہ فرمایا گیا ہے کہ وَمَنْ اَحْیَاهَا فَکَاَنَّمَا اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا۔ "اور جس نے کسی نفس کو بچایا اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخشی"۔ آدمی کو موت سے بچانے کی بے شمار شکلیں ہیں۔ ایک آدمی بیمار یا زخمی ہے، قطع نظر اس سے

کہ وہ کس نسل، کس قوم یا کس رنگ کا ہے۔ اگر وہ آپ کو بیماری کی حالت میں یا زخمی ہونے کی حالت میں ملا ہے تو آپ کا کام یہ ہے کہ اس کی بیماری یا اس کے زخم کے علاج کی فکر کریں۔ اگر وہ بھوک سے مر رہا ہے تو آپ کا کام یہ ہے کہ اس کو کھلائیں تاکہ اس کی جان محفوظ ہو جائے۔ اگر وہ ڈوب رہا ہے یا اور کسی طرح سے اس کی جان خطرے میں ہے تو آپ کا فرض ہے کہ اس کو بچائیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ یہودیوں کی مذہبی کتاب تلمود میں بعینہٖ اس آیت کا مضمون درج ہے، مگر اس کی عبارت یہ ہے کہ "جس نے اسرائیل کی ایک جان کو ہلاک کیا، الکتاب (SCRIPTURE) کی نگاہ میں اس نے گویا ساری دنیا کو ہلاک کر دیا، اور جس نے اسرائیل کی ایک جان کو محفوظ رکھا الکتاب کے نزدیک اس نے گویا ساری دنیا کی حفاظت کی۔" تلمود میں یہ بھی صاف لکھا ہے کہ اگر کوئی غیر اسرائیلی ڈوب رہا ہو اور تم نے اسے بچانے کی کوشش کی تو گناہ گار ہوگے۔ نسل پرستی کا کرشمہ دیکھیے۔ ہم ہر انسان کی جان بچانے کو اپنا فرض سمجھتے ہیں، کیونکہ قرآن مجید نے ایسا ہی حکم دیا ہے۔ لیکن وہ اگر بچانا ضروری سمجھتے ہیں تو صرف بنی اسرائیل کی جان کو، باقی رہے دوسرے انسان تو دینِ یہود میں وہ انسان سمجھے ہی نہیں جاتے۔ ان کے ہاں گوئیم کا تصور، جس کے لیے انگریزی میں (GENTILE) اور عربی میں اُمّی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، یہ ہے کہ ان کے کوئی انسانی حقوق نہیں ہیں۔ انسانی حقوق صرف بنی اسرائیل کے لیے مخصوص ہیں۔ قرآن مجید میں بھی اس کا ذکر آیا ہے کہ یہودی کہتے ہیں لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ "ہمارے اُوپر اُمّیوں کے بارے میں (یعنی ان کا مال مار کھانے میں) کوئی گرفت نہیں ہے۔"

۳۔ عورت کی عصمت کا احترام تیسری اہم چیز اسلام کے دیے ہوئے انسانی حقوق میں یہ ہے کہ عورت کی عصمت بہرحال محترم ہے، خواہ وہ اپنی قوم کی ہو، یا دشمن قوم کی، جنگل بیابان میں ملے یا کسی مفتوح شہر میں، ہماری ہم مذہب ہو یا کسی غیر مذہب سے تعلق رکھتی ہو، یا لامذہب ہو۔ مسلمان کسی حالت میں بھی اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ اس کے لیے زنا کو مطلقاً حرام کیا گیا ہے، خواہ اُس کا ارتکاب کسی عورت سے کیا جائے۔ قرآن مجید کے الفاظ ہیں لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی۔ "زنا کے قریب نہ پھٹکو"۔ اور مزید برآں اس فعل کی سزا مقرر کر دی گئی ہے۔ یہ حکم کسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے۔ عورت کی عصمت پر ہاتھ ڈالنا ہر حالت میں حرام ہے اور کوئی مسلمان اس فعل کا ارتکاب کر کے سزا سے نہیں بچ سکتا، خواہ دنیا میں سزا پائے یا آخرت میں۔ عورت کی عصمت کے احترام کا یہ تصور اسلام کے سوا کہیں نہیں پایا جاتا۔ مغربی فوجوں کو تو اپنے ملک میں بھی "رفعِ حاجت" کے لیے خود اپنی قوم کی بیٹیاں درکار ہوتی ہیں، اور غیر قوم کے ملک پر اُن کا قبضہ ہو جائے تو اُس ملک کی عورتوں کا جو حشر

ہوتا ہے وہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ لیکن مسلمانوں کی تاریخ، مُنفرِد انسانی غلطیوں سے قطع نظر، اِس سے خالی رہی ہے کہ کسی ملک کو فتح کرنے کے بعد ان کی فوجیں ہر طرف عام بدکاری کرتی پھری ہوں، یا ان کے اپنے ملک میں حکومت نے ان کے لیے فاحشات فراہم کرنے کا انتظام کیا ہو۔ یہ بھی ایک بڑی نعمت ہے جو نوعِ انسانی کو اسلام کی بدولت نصیب ہوئی ہے۔[ا]

۴۔ ہر سائل و محروم کا یہ حق کہ اس کی مدد کی جائے

قرآن مجید میں یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ وَ فِیْٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ”اور مسلمانوں کے مالوں میں مدد مانگنے والے اور محروم رہ جانے والے کا حق ہے“۔ اوّل تو اِس حکم کے الفاظ بجائے خود مطلق ہیں، پھر یہ حکم مکّے میں دیا گیا تھا، جہاں کوئی مسلم معاشرہ باقاعدہ بنا ہی نہ تھا اور بالعموم مسلمانوں کا سابقہ غیرمسلم آبادی ہی سے پیش آتا تھا۔ اس لیے آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسلمان کے مال پر ہر مدد مانگنے والے اور ہر محروم رہ جانے والے انسان کا حق ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ اپنی قوم یا اپنے ملک کا ہو یا کسی قوم، ملک یا نسل سے تعلق رکھتا ہو۔ آپ استطاعت رکھتے ہوں اور کوئی حاجت مند آپ سے مدد مانگے، یا آپ کو معلوم ہو جائے کہ وہ حاجتمند ہے تو ضرور اس کی مدد کریں۔ خدا نے آپ پر اُس کا یہ حق قائم کر دیا ہے۔

۵۔ ہر انسان کا حق آزادی

اسلام میں کسی آزاد انسان کو پکڑ کر غلام بنانا یا اسے بیچ ڈالنا قطعی حرام قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاف الفاظ یہ ہیں کہ تین قسم کے لوگ ہیں جن کے خلاف قیامت کے روز میں خود مُستَغِیث ہوں گا۔ ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو کسی آزاد انسان کو پکڑ کر بیچے اور اُس کی قیمت کھائے (رَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَاَکَلَ ثَمَنَہٗ)۔ اس فرمانِ رسولؐ کے الفاظ بھی عام ہیں۔ ان کو کسی قوم یا نسل یا ملک و وطن کے انسان کے ساتھ مخصوص نہیں کیا گیا ہے۔ اہل مغرب کو بڑا فخر ہے کہ انہوں نے غلامی کا انسداد کیا ہے، حالانکہ انہیں یہ قدم اُٹھانے کی توفیق پچھلی صدی کے وسط میں نصیب ہوئی ہے۔ اس سے پہلے جس بڑے پیمانے پر وہ افریقہ سے آزاد انسانوں کو پکڑ پکڑ کر اپنی نوآبادیوں میں لے جاتے رہے ہیں، اور ان کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کرتے رہے ہیں اس کا ذکر اُن کی اپنی ہی لکھی ہوئی کتابوں میں موجود ہے۔

[ا] اسلامی نقطۂ نظر سے عصمت صرف عورت ہی کی نہیں مرد کی بھی ہوتی ہے۔ جو شخص زنا کرتا ہے وہ عورت کی عصمت ہی خراب نہیں کرتا، اپنی عصمت بھی خراب کرتا ہے۔

مغربی اقوام کی غلام سازی امریکہ اور جزائر غرب الہند وغیرہ پر ان قوموں کا قبضہ ہونے کے بعد ساڑھے تین سو سال تک غلامی کی یہ ظالمانہ تجارت جاری رہی ہے۔ افریقہ کے جس ساحل پر اندرونِ ملک سے سیاہ فام لوگوں کو پکڑ پکڑ کر لایا جاتا اور بندرگاہوں سے ان کو آگے روانہ کیا جاتا تھا، اس کا نام ہی ساحلِ غلامان (SLAVE COAST) پڑ گیا تھا۔ صرف ایک صدی میں (۱۶۸۰ء سے ۱۷۸۶ء تک) صرف برطانوی مقبوضات کے لیے جتنے آدمی پکڑ کر لے جائے گئے ان کی تعداد خود برطانوی مصنفین نے دو کروڑ بتائی ہے۔ صرف ایک سال ایسا بتایا گیا ہے (۱۷۹۰ء) جس میں ۷۵ ہزار افریقی پکڑے اور غلام بنائے گئے۔ جن جہازوں میں وہ لے جائے جاتے تھے اُن میں اِن افریقیوں کو بالکل جانوروں کی طرح ٹھونس کر بند کر دیا جاتا تھا، اور بہت سوں کو زنجیروں سے باندھ دیا جاتا تھا، ان کو نہ ٹھیک سے غذا دی جاتی تھی، نہ بیمار پڑیں یا زخمی ہو جائیں تو ان کے علاج کی فکر کی جاتی تھی۔ مغربی مصنفین کا اپنا بیان ہے کہ غلام بنانے اور جبری خدمت لینے کے لیے جتنے افریقی پکڑے گئے تھے ان میں سے ۲۰ فیصدی کا راستے ہی میں خاتمہ ہو گیا۔ یہ بھی اندازہ کیا جاتا ہے کہ مجموعی طور پر مختلف مغربی اقوام نے جتنے افراد کو پکڑا تھا ان کی تعداد دس کروڑ تک پہنچتی تھی۔ اس تعداد میں تمام مغربی اقوام کی غلام سازی کے اعداد و شمار شامل ہیں۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کا یہ منہ ہے کہ ہم پر شب و روز غلامی کو جائز رکھنے کا الزام لگاتے رہیں۔ گویا نکٹا کسی ناک والے کو طعنہ دے رہا ہے کہ تیری ناک چھوٹی ہے۔

اسلام میں غلامی کی حیثیت مختصراً میں آپ کو یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ اسلام میں غلامی کی نوعیت کیا ہے۔ عرب میں جو لوگ اسلام سے پہلے کے غلام چلے آ رہے تھے ان کے مسئلے کو اسلام نے اس طرح حل کیا کہ ہر ممکن طریقے سے اُن کو آزاد کرنے کی ترغیب دلائی۔ لوگوں کو حکم دیا گیا کہ اپنے بعض گناہوں کے کفاروں میں اُن کو آزاد کریں۔ برضا و رغبت خود کسی غلام کو آزاد کرنا ایک بڑی نیکی کا کام قرار دیا گیا۔ یہاں تک کہا گیا کہ آزاد کرنے والے کا ہر عضو اُس غلام کے ہر عضو کے بدلے میں دوزخ سے بچ جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلافتِ راشدہ کے دَور تک پہنچتے پہنچتے عرب کے تمام قدیم غلام آزاد ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ۶۳ غلام آزاد کیے۔ حضرت عائشہؓ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد ۶۷ تھی۔ حضرت عباسؓ نے ۷۰، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک ہزار اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے ۳۰ ہزار غلام خرید کر آزاد کر دیے۔ ایسے ہی بہت سے صحابہ کے متعلق روایات میں تفصیل آئی ہے کہ انہوں نے کتنے بندگانِ خدا کو غلامی سے رہا کیا تھا۔ اس طرح پرانے دور کی غلامی کا مسئلہ ۳۰، ۴۰ سال میں حل کر دیا گیا۔ اس کے بعد اسلام میں غلامی کی جو شکل

باقی رکھی گئی وہ صرف یہ تھی کہ جو قیدی جنگ میں پکڑے گئے ہوں ان کو اسلامی حکومت اُس وقت تک اپنے پاس رکھے جب تک ان کی حکومت ہمارے قیدیوں کو چھوڑ کر اپنے قیدی تبادلے میں حاصل نہ کر لے، یا وہ اُن کا فدیہ ادا کر کے انہیں رہا نہ کرا لے۔ اگر یہ دونوں صورتیں پیش نہ آتیں تو اسلامی حکومت اُن کو گرفتار کرنے والی فوج کے سپاہیوں میں تقسیم کر دیتی تھی اور وہ اُن کے مالک ہو جاتے تھے۔ یہ اِس سے زیادہ انسانی طریقہ تھا کہ ان کو قیدیوں کے باڑوں (CONCENTRATION CAMPS) میں رکھا جاتا اور ان سے جبری خدمت (FORCED LABOUR) لی جاتی اور اُن کی جو عورتیں گرفتار ہوتیں انہیں (PROSTITUTION) قحبہ گری کے لیے مختص کر دیا جاتا۔ اِس بے رحمانہ اور فتنہ پرور طریقے کے بجائے اسلام نے یہ پسند کیا کہ آبادی میں اُن کو پھیلا دیا جائے اور افراد کو افراد سے سابقہ پیش آئے۔ اس کے ساتھ مالکوں کو یہ حکم دیا گیا کہ ان سے نیک سلوک کرو۔ اِسی کا نتیجہ تھا کہ بیرونی قوموں کے جو لوگ مسلمانوں میں پکڑے ہوئے آئے اور غلام بنا لیے گئے وہ زیادہ تر مسلمان ہو گئے اور ان کی اولادوں میں مسلمانوں کے بڑے بڑے اَئمہ پیدا ہوئے، بڑے بڑے فقہاء پیدا ہوئے، نامور محدثین پیدا ہوئے، سلطنتوں کے مدبر اور فوجوں کے سپہ سالار پیدا ہوئے، حتیٰ کہ آگے چل کر وہ مسلمان ملکوں کے حکمران بنے۔ موجودہ زمانے میں اس مسئلے کا جو حل تجویز کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جنگ کے بعد فریقین کے جنگی قیدیوں کا تبادلہ کر لیا جائے۔ مسلمان اِس کے لیے پہلے سے تیار تھے، بلکہ جہاں کہیں فریقِ مخالف نے قیدیوں کے تبادلے کو قبول کیا وہاں بلا تکلف اس تجویز پر عمل کیا گیا۔ لیکن اگر اِس زمانے کی کسی لڑائی میں ایک حکومت مکمل طور پر شکست کھا جائے اور غالب آنے والی طاقت اپنے آدمیوں کو چھڑا لے اور مغلوب حکومت باقی ہی نہ رہے کہ اپنے آدمیوں کو چھڑا سکے تو تجربہ یہ بتاتا ہے کہ مغلوب قوم کے قیدیوں کو غلامی سے بدتر حالت میں رکھا جاتا ہے۔ ہمیں بتایا جائے کہ گزشتہ جنگ عظیم میں روس نے جرمنی اور جاپان کے جو قیدی پکڑے تھے ان کا حشر کیا ہوا۔ ان کا آج تک حساب نہیں ملا ہے۔ کچھ نہیں معلوم کہ کتنے زندہ رہے اور کتنے مر کھپ گئے۔ ان سے جو خدمات لی گئیں وہ غلاموں کی خدمت سے بدتر تھیں۔ غالباً فرعون کے زمانے میں اَہرام بنانے کے لیے غلاموں سے اُتنی ظالمانہ خدمات نہ لی گئی ہوں گی جتنی روس میں سائبیریا اور غیر ترقی یافتہ علاقوں کو ترقی دینے کے لیے جنگی قیدیوں سے لی گئیں۔

اب میں اس ضمنی بحث کو چھوڑ کر اپنے اصل موضوع پر آتا ہوں۔

۶- ہر انسان کا یہ حق کہ اس کے ساتھ انصاف کیا جائے یہ ایک بڑا اہم حق ہے جو اسلام نے انسان کو بحیثیتِ انسان

عطا کیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ .... اَنْ تَعْتَدُوْا۔ "کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے .... کہ تم ناروا زیادتی کرنے لگو"۔ آگے چل کر اسی سلسلے میں پھر فرمایا۔ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا، اِعْدِلُوْا، ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔ "اور کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو یہی تقویٰ سے قریب تر ہے"۔ ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ۔ "اے لوگو جو ایمان لائے ہو انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو"۔ معلوم ہوا کہ عام انسان ہی نہیں دشمنوں تک سے انصاف کرنا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں اسلام جس انصاف کی دعوت دیتا ہے وہ محض اپنے ملک کے باشندوں کے لیے، یا اپنی قوم کے لوگوں کے لیے، یا مسلمانوں کے لیے ہی نہیں، بلکہ دنیا بھر کے سب انسانوں کے لیے ہے۔ ہم کسی سے بھی بے انصافی نہیں کر سکتے۔ ہمارا مستقل شیوہ یہ ہونا چاہیے کہ کوئی شخص بھی ہم سے بے انصافی کا اندیشہ نہ رکھے اور ہم ہر جگہ ہر شخص کے ساتھ عدل و انصاف ملحوظ رکھیں۔

۷- انسانی مساوات اسلام نہ صرف یہ کہ کسی امتیاز رنگ و نسل کے بغیر تمام انسانوں کے درمیان مساوات کو تسلیم کرتا ہے بلکہ اسے ایک اہم اصولی حقیقت قرار دیتا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا، اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ "اے انسانو ہم نے تم کو ایک ماں اور ایک باپ سے پیدا کیا"۔ بالفاظِ دیگر اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام انسان اصل میں بھائی بھائی ہیں۔ ایک ہی ماں اور ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ "اور ہم نے تم کو قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو"۔ یعنی قوموں اور قبیلوں میں یہ تقسیم تعارف کے لیے ہے۔ اس لیے ہے کہ ایک قبیلے یا ایک قوم کے لوگ آپس میں ایک دوسرے سے واقف ہوں اور باہم تعاون کر سکیں۔ اس لیے نہیں ہے کہ ایک قوم دوسری قوم پر فخر جتلائے اور اس کے ساتھ تکبر سے پیش آئے، اس کو ذلیل سمجھے اور اس کے حقوق پر ڈاکے مارے۔ "درحقیقت تم میں سے معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ خدا ترس ہے"۔ یعنی انسان پر انسان کی فضیلت صرف اخلاق اور پاکیزہ کردار کی بنا پر ہے، نہ کہ رنگ و نسل، زبان یا وطن کی بنا پر۔ اور یہ فضیلت بھی اس غرض کے لیے نہیں ہے کہ پاکیزہ اخلاق کے انسان دوسرے انسانوں پر اپنی بڑائی جتائیں۔ کیونکہ بڑائی جتانا بجائے خود ایک بُرائی ہے جس کا ارتکاب کوئی خدا ترس اور پرہیزگار آدمی نہیں کر سکتا، اور یہ اس غرض کے لیے بھی نہیں ہے کہ نیک آدمی

کے حقوق بُرے آدمیوں کے حقوق پر فائق ہوں، یا اُس کے حقوق اُن سے زیادہ ہوں، کیونکہ یہ انسانی مساوات کے خلاف ہے جس کو اس آیت کی ابتدا میں اصول کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ یہ فضیلت دراصل اس وجہ سے ہے کہ نیکی اخلاقی حیثیت سے بُرائی کے مقابلے میں بہر حال افضل ہے۔ اِسی مضمون کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ، وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ، وَلَا لِاَحْمَرَ عَلَى الْاَسْوَدِ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلَى الْاَحْمَرِ۔ كُلُّكُمْ اَبْنَاءُ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ۔ "کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے، نہ عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت ہے۔ نہ گورے کو کالے پر اور نہ کالے کو گورے پر کوئی فضیلت ہے۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔" اس طرح اسلام نے تمام نوعِ انسانی میں مساوات قائم کی اور رنگ، نسل، زبان اور قومیت کی بنا پر سارے امتیازات کی جڑ کاٹ دی۔ اسلام کے نزدیک یہ حق انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے کہ اس کے ساتھ اس کی کھال کے رنگ، یا اس کی پیدائش کی جگہ یا اس کو جنم دینے والی نسل و قوم کی بنا پر کوئی امتیاز نہ برتا جائے، اسے دوسروں کی بہ نسبت حقیر نہ ٹھیرایا جائے، اور اس کے حقوق دوسروں سے کم تر نہ رکھے جائیں۔ امریکہ کے افریقی النسل لوگوں کا مشہور لیڈر مَیلکم اِکس، جو سیاہ نسل کے باشندوں کی حمایت میں سفید نسل والوں کے خلاف مدتوں شدید کشمکش کرتا رہا تھا، مسلمان ہونے کے بعد جب حج کے لیے گیا اور وہاں اس نے دیکھا کہ ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ غرض ہر جگہ کے اور ہر رنگ و نسل کے مسلمان ایک ہی لباس میں ایک خدا کے گھر کی طرف چلے جا رہے ہیں، ایک ہی گھر کا طواف کر رہے ہیں، ایک ہی ساتھ نماز پڑھ رہے ہیں اور ان میں کسی قسم کا امتیاز نہیں ہے، تو وہ پکار اُٹھا کہ یہ ہے نسل اور رنگ کے مسئلے کا حل، نہ کہ وہ جو ہم امریکہ میں اب تک کرتے رہے ہیں۔ آج خود غیر مسلم مفکرین بھی، جو اندھے تعصب میں مبتلا نہیں ہیں، یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس مسئلے کو جس کامیابی کے ساتھ اسلام نے حل کیا ہے کوئی دوسرا مذہب و مسلک نہیں کر سکا ہے۔

۸۔ **نیکی میں ہر ایک سے تعاون اور بدی میں کسی سے تعاون نہیں** اسلام نے ایک بڑا اہم قاعدۂ کلیہ یہ پیش کیا ہے کہ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ "نیکی اور پرہیز گاری میں تعاون کرو۔ بدی اور گناہ کے معاملے میں تعاون نہ کرو۔" اس کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص بھلائی اور خدا ترسی کا کام کرے، قطعِ نظر اس سے کہ وہ قطبِ شمالی کا رہنے والا ہو یا قطبِ جنوبی کا، وہ یہ حق رکھتا ہے کہ ہم اس سے تعاون کریں اور بجا طور پر یہ توقع رکھ سکتا ہے کہ ہم اُس سے تعاون کریں گے۔ اِس کے برعکس جو شخص بدی اور

زیادتی کا کام کرے، خواہ وہ ہمارا قریب ترین ہمسایہ یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، اس کا نہ یہ حق ہے کہ نسل و وطن یا زبان و قومیت کے نام پر وہ ہمارا تعاون طلب کرے، نہ اُسے ہم سے یہ اُمید رکھنی چاہیے کہ ہم اُس سے تعاون کریں گے، نہ ہمارے لیے یہ جائز ہے کہ ایسے کسی کام میں اُس کے ساتھ تعاون کریں۔ بدکار ہمارا بھائی ہی کیوں نہ ہو ہمارا اور اُس کا کوئی ساتھ نہیں ہے۔ نیک کام کرنے والا خواہ ہم سے کوئی رشتہ نہ رکھتا ہو، ہم اُس کے ساتھی اور مددگار ہیں، یا کم از کم خیر خواہ تو ضرور ہی ہیں۔

برسرِ جنگ دشمنوں کے حقوق

بین الاقوامی "قانون" کی حیثیت اب قبل اس کے کہ میں اسلامی ریاست کے شہریوں کے حقوق بیان کروں میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ دشمنوں کے کیا حقوق اسلام نے بتائے ہیں۔ جنگ کی تہذیب کے تصور سے دنیا قطعاً ناآشنا تھی۔ مغربی دنیا اِس تصور سے پہلی مرتبہ سترھویں صدی کے مفکر گروشیوس (GROTIUS) کے ذریعے سے آشنا ہوئی۔ مگر عملی طور پر بین الاقوامی قوانینِ جنگ کی تدوین انیسویں صدی کے وسط میں شروع ہوئی۔ اس سے پہلے جنگ کی تہذیب کا کوئی تصور اہلِ مغرب کے ہاں نہیں پایا جاتا تھا۔ جنگ میں ہر طرح کے ظلم و ستم کیے جاتے تھے اور کسی قسم کے حقوق برسرِ جنگ قوم کے نہیں مانے جاتے تھے۔ انیسویں صدی میں اور اس کے بعد سے اب تک جو قوانین بھی بنائے گئے ہیں ان کی اصل نوعیت قانون کی نہیں بلکہ مُعاہدات کی سی ہے اور ان کو بین الاقوامی قانون کہنا درحقیقت لفظِ "قانون" کا بیجا استعمال ہے، کیونکہ کوئی قوم بھی جنگ میں اس کو اپنے لیے واجب العمل نہیں سمجھتی، اِلّا یہ کہ فریقِ ثانی بھی اُس کی پابندی کرے۔ بالفاظِ دیگر جنگ کے ان مہذب قوانین میں یہ مفروضہ کام کر رہا ہے کہ اگر ہمارا حریف ان کا احترام کرے گا تو ہم بھی کریں گے اور اگر وہ جنگ کے وحشیانہ طریقوں پر اُتر آئے گا تو ہم بھی بے دریغ وہی طریقے استعمال کریں گے۔ ظاہر ہے کہ اس چیز کا نام قانون نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جنگ میں ان نام نہاد بین الاقوامی قواعد و ضوابط کے پُرزے اُڑائے گئے اور ہر مرتبہ اِن پر نظرِ ثانی اور اِن میں کمی و بیشی ہوتی رہی۔

اسلامی قانونِ جنگ و صلح کی حیثیت اسلام نے اس کے برعکس جنگ کی جو تہذیب قائم کی ہے اس کی صحیح حیثیت قانون کی ہے، کیونکہ وہ مسلمانوں کے لیے اللہ اور رسول کے دیے ہوئے احکام ہیں جن کی پابندی ہم ہر حال میں کریں گے خواہ ہمارا دشمن کچھ ہی کرتا رہے۔ اب یہ دیکھنا ہر صاحبِ علم کا کام ہے کہ جو قانونِ جنگ ۱۴ سو برس

پہلے مقرر کیا گیا تھا، مغرب نے اس کی خوشہ چینی کی ہے یا نہیں، اور خوشہ چینی کرکے بھی وہ تہذیب جنگ کے اُس مقام تک پہنچ سکا ہے یا نہیں جس پر اسلام نے ہمیں پہنچایا تھا۔ اہلِ مغرب بسا اوقات یہ دعویٰ کیا کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کچھ یہود و نصاریٰ سے لے لیا ہے۔ اس لیے بائبل کو بھی پڑھ ڈالیے تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ اِن مدعیان تہذیب کی کتابِ مقدس جنگ کے کن طریقوں کی ہدایت دیتی ہے[1]

ابتدا ہی میں یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ اسلام میں انسان بحیثیت انسان کے جو حقوق بیان کیے گئے ہیں ان کا اعادہ کرنے کی اب ضرورت نہیں ہے۔ ان کو ذہن میں رکھتے ہوئے دیکھیے کہ دشمن انسان کے کیا حقوق اسلام میں مقرر کیے گئے ہیں۔

غیر مقاتلین کے حقوق | اسلام میں سب سے پہلے دشمن ملک کی مُقاتِل (COMBATANT) اور غیر مقاتل (NON-COMBATANT) آبادی کے درمیان فرق کیا گیا ہے۔ جہاں تک غیر مقاتل آبادی کا تعلق ہے (یعنی جو لڑنے والی نہیں ہے یا لڑنے کے قابل نہیں ہے، مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار، اندھے، اپاہج وغیرہ) اُس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات یہ ہیں:

جو لڑنے والے نہیں ہیں ان کو قتل نہ کیا جائے | لَا تَقْتُلُوْا شَيْخًا فَانِيًا وَلَا طِفْلًا صَغِيْرًا وَلَا امْرَأَةً "کسی بوڑھے، کسی بچے اور کسی عورت کو قتل نہ کرو۔"

لا تقتلوا اصحاب الصوامع "خانقاہ نشین راہبوں کو قتل نہ کرو" یا عبادت گاہوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو نہ مارو۔"

جنگ میں ایک موقع پر حضورؐ نے ایک عورت کی لاش دیکھی تو فرمایا "یہ تو نہیں لڑ رہی تھی"۔ اس سے فقہائے اسلام نے یہ اصول اخذ کیا کہ جو لوگ غیر مقاتل ہوں ان کو قتل نہ کیا جائے۔

مُقاتلین کے حقوق | اس کے بعد دیکھیے کہ لڑنے والوں کو کیا حقوق اسلام نے دیے ہیں۔

۱- آگ کا عذاب نہ دیا جائے | حدیث میں حضورؐ کا ارشاد ہے کہ لا ینبغی ان یعذب بالنار الا رب النار "آگ کا عذاب آگ کے رب کے سوا کسی کو زیب نہیں دیتا"۔ اس سے یہ حکم نکلا کہ دشمن کو زندہ نہ جلایا جائے۔

---

[1] اس غرض کے لیے بائبل کی کتاب خروج (EXODUS) باب ۳۴- کتاب گنتی (NUMBERS) باب ۳۱- کتاب استثنا (DEUTERONOMY) ابواب ۲۰،۷،۲- اور کتاب یشوع (JOSHUA) ابواب ۸،۶ کو پڑھ لینا کافی ہے۔

۲۔ زخمی پر حملہ نہ کیا جائے | لا تجھزن علی جریح۔ "کسی زخمی پر حملہ نہ کرو"۔ مراد ہے وہ زخمی جو لڑنے کے قابل نہ رہا ہو نہ عملاً لڑ رہا ہو۔

۳۔ قیدی کو قتل نہ کیا جائے | لا یقتلنّ اسیرٌ۔ "کسی قیدی کو نہ قتل کیا جائے"۔

۴۔ باندھ کر قتل نہ کیا جائے | نھی النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم عن قتل الصبر۔ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے باندھ کر قتل کرنے یا قید کی حالت میں قتل کرنے سے منع فرمایا"۔ حضرت ابوایوبؓ انصاری، جنہوں نے یہ روایت حضورؐ سے نقل کی ہے، فرماتے ہیں کہ "جس خدا کے ہاتھ میں میری جان ہے میں اس کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں کسی مرغ کو بھی باندھ کر ذبح نہ کروں گا"۔

۵۔ غنیم کے ملک میں عام غارت گری یا لوٹ مار نہ کی جائے | یہ ہدایت بھی کی گئی کہ غنیم کے ملک میں داخل ہو تو عام تباہی نہ پھیلاؤ، بستیوں کو ویران نہ کرو، سوائے اُن لوگوں کے جو تم سے لڑتے ہیں اور کسی شخص کے مال پر ہاتھ نہ ڈالو۔ حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن النھبیٰ۔ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لُوٹ مار سے منع فرمایا"۔ اور آپ کا ارشاد تھا کہ اِنّ النھبی لیست بِاَحَلّ من المیتة۔ "لوٹ کا مال مردار سے زیادہ حلال نہیں ہے"۔ یعنی وہ بھی مردار کی طرح حرام ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فوجوں کو روانہ کرتے وقت ہدایت فرماتے تھے کہ "بستیوں کو ویران نہ کرنا، کھیتیوں اور باغوں کو برباد نہ کرنا، مویشیوں کو ہلاک نہ کرنا"۔ (مالِ غنیمت کا معاملہ اس سے مختلف ہے، اس سے مراد وہ مال ہے جو غنیم کے لشکروں، اس کے فوجی کیمپوں اور اس کی چھاؤنیوں میں ملے۔ اس کو ضرور اسلامی فوجیں اپنے قبضے میں لیں گی۔ لیکن عام لُوٹ مار وہ نہیں کرسکتیں)۔

۶۔ مفتوح علاقے کے لوگوں سے کوئی چیز مُفت یا بلا اجازت نہ لی جائے | اس بات سے بھی منع کر دیا گیا کہ عام آبادی کی کسی چیز سے معاوضہ ادا کیے بغیر فائدہ اُٹھایا جائے۔ دورانِ جنگ میں اگر دشمن کے کسی علاقے پر قبضہ کر کے مسلمانوں کی فوج وہاں مقیم ہو تو اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ لوگوں کی چیزوں کا بے دریغ استعمال کرے۔ اگر اس کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو اسے خرید کر لینا چاہیے، یا مالکوں کی اجازت لے کر اس کو استعمال کرنا چاہیے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ فوجوں کو روانہ کرتے وقت یہاں تک فرماتے تھے کہ دُودھ دینے والے جانوروں کا دُودھ بھی تم نہیں پی سکتے جب تک کہ ان کے مالکوں سے اجازت نہ لے لو۔

۷۔ دشمن کی لاشوں پر غصہ نہ نکالا جائے | اسلام میں قطعی طور پر اس بات کو بھی منع کیا گیا ہے کہ دشمن کی لاشوں کی

تذلیل کی جائے یا ان کا مُثلہ کیا جائے۔ حدیث میں آیا ہے کہ نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن المثلۃ۔ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمنوں کی لاشوں کا مثلہ (یعنی ان کی قطع و برید) کرنے سے منع فرمایا"۔ یہ حکم جس موقع پر دیا گیا وہ بھی نہایت سبق آموز ہے۔ جنگِ احد میں جو مسلمان شہید ہوئے تھے، دشمنوں نے ان کی ناک کاٹ کر ان کے ہار بنائے اور گلوں میں پہنے۔ حضورؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کا پیٹ چیر کر ان کا کلیجہ نکالا گیا اور اسے چبانے کی کوشش کی گئی۔ اس وقت مسلمانوں کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ مگر حضورؐ نے فرمایا کہ تم غنیم کے مقتولوں کے ساتھ یہ سلوک نہ کرنا۔ اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ دین فی الحقیقت خداوند عالم ہی کا بھیجا ہوا دین ہے۔ اس میں انسانی جذبات کا اگر دخل ہوتا تو جنگِ احد میں یہ منظر دیکھ کر حکم دیا جاتا کہ تم بھی غنیم کے مقتولوں کا اسی طرح مُثلہ کرو۔

۸۔ دشمن کی لاشیں اس کے حوالے کرنا جنگ احزاب میں دشمن کا ایک بڑا مشہور شہسوار مر کر خندق میں گر گیا۔ کفار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دس ہزار دینار پیش کیے کہ اس کی لاش ہمیں دے دیجیے۔ آپ نے فرمایا کہ میں مُردے بیچنے والا نہیں ہوں، تم لے جاؤ اپنی لاش۔

۹۔ بدعہدی کی سخت ممانعت اسلام میں بدعہدی کی بھی سختی سے ممانعت کر دی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوجوں کو بھیجتے وقت جو ہدایات دیتے تھے ان میں سے ایک یہ تھی کہ لا تغدِروا "بدعہدی نہ کرنا"۔ قرآن مجید اور احادیث میں اس حکم کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے کہ دشمن اگر عہد و پیمان کی خلاف ورزی کرتا ہے تو کرے، لیکن تم کو اپنے عہد و پیمان کی خلاف ورزی کبھی نہ کرنی چاہیے۔ صلح حدیبیہ کا مشہور واقعہ ہے کہ صلح نامہ طے ہو جانے کے بعد ایک مسلمان نوجوان ابو جندلؓ، جن کا باپ صلح نامے کی شرائط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے طے کر رہا تھا، بیڑیوں میں بھاگتے ہوئے آئے اور انہوں نے کہا مسلمانو مجھے بچاؤ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اب معاہدہ ہو چکا ہے۔ اب ہم تمہاری مدد نہیں کر سکتے، تم واپس جاؤ۔ اللہ تمہارے لیے کوئی راستہ کھولے گا۔ ان کی حالت زار کو دیکھ کر مسلمانوں کی پوری فوج رو پڑی۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فرما دیا کہ عہد کی خلاف ورزی ہم نہیں کر سکتے تو ان کو بچانے کے لیے ایک ہاتھ بھی آگے نہ بڑھا اور کفار ان کو زبردستی گھسیٹ کر لے گئے۔ یہ عہد و پیمان کی پابندی کی بے نظیر مثال ہے اور اسلامی تاریخ میں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔

۱۰۔ جنگ سے پہلے اعلانِ جنگ کا حکم قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً "

فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ " اگر تمہیں کسی قوم سے خیانت (یعنی عہد شکنی) کا خطرہ ہو تو اس کا عہد علانیہ اس کے منہ پر مار دو" اس آیت میں اس بات سے منع کر دیا گیا ہے کہ اعلانِ جنگ کے بغیر دشمن کے خلاف جنگ چھیڑ دی جائے، اِلّا یہ کہ دوسرا فریق جارحانہ کارروائیوں کی ابتدا کر چکا ہو۔ اگر دوسرے فریق نے اعلان کے بغیر جارحانہ کارروائیوں کی ابتدا کر دی ہو تو پھر ہم بلا اعلان اس کے خلاف جنگ کر سکتے ہیں۔ ورنہ قرآن مجید ہمیں یہ حکم دے رہا ہے کہ علانیہ اس کو بتا دو کہ اب ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی عہد باقی نہیں رہا ہے اور اب ہم اور تم برسرِ جنگ ہیں۔ اگرچہ موجودہ بین الاقوامی قانون کا تقاضا بھی یہ ہے کہ اعلانِ جنگ کے بغیر جنگ نہ کی جائے۔ لیکن اس بیسویں صدی میں بھی تمام بڑی بڑی لڑائیاں بلا اعلانِ جنگ شروع ہوئی ہیں۔ وہ اُن کا اپنا بنایا ہوا قانون ہے، اس لیے وہ اپنے ہی قانون کو توڑنے کے مجاز ہیں۔ مگر ہمارے لیے یہ خدا کا دیا ہوا قانون ہے ہم اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔

اسلامی ریاست میں شہریوں کے حقوق

اب میں آپ کو شہریوں کے حقوق بتانا چاہتا ہوں۔ یہ حقوق اُن حقوق سے زائد ہیں جو ابھی تھوڑی دیر پہلے میں انسان بحیثیت انسان کے حقوق بیان کر چکا ہوں۔

۱- جان و مال کا تحفظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حَجَّۃُ الْوَدَاع کے موقع پر جو تقریر فرمائی تھی اس میں فرمایا تھا کہ تمہاری جانیں اور تمہارے مال ایک دوسرے پر قیامت تک کے لیے حرام ہیں (اِنَّ دِمَآءَكُمْ وَاَمْوَالَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ اِلٰٓى اَنْ تَلْقَوْا رَبَّكُمْ)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا۔ " جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اللہ نے اس پر لعنت فرمائی ہے اور اس کے لیے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے"۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ذمیوں کے متعلق بھی فرمایا کہ مَنْ قَتَلَ مُعَاهِدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ۔ "جس نے کسی معاہِد (یعنی ذمی) کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو تک نہ سونگھ سکے گا۔ قرآن قتلِ نفس کو حرام قرار دینے کے بعد اس میں صرف ایک استثنا رکھتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایسا قتل حق کے ساتھ ہو، یعنی ناحق نہ ہو بلکہ کوئی قانونی حق اس کا تقاضا کرتا ہو کہ آدمی کو قتل کیا جائے۔ اور ظاہر ہے کہ حق اور ناحق کا فیصلہ ایک عدالت ہی کر

سکتی ہے، اور جنگ یا بغاوت کی صورت میں ایک عادل حکومت، یعنی شریعت کی پابند حکومت ہی یہ طے کر سکتی ہے کہ برحق جنگ کونسی ہے جس میں انسانی خون بہانا جائز ہو، اور قانونِ اسلام کی رو سے باغی کون قرار پاتا ہے جس پر تلوار اٹھائی جائے، یا جس کو موت کی سزا دی جائے۔ یہ فیصلے نہ کسی ایسی عدالت پر چھوڑے جا سکتے ہیں جو خدا سے بے خوف انتظامیہ سے مرعوب و خوفزدہ ہو کر انصاف کا خون کرنے لگے، اور نہ کسی ایسی حکومت کے جرائم قرآن و حدیث کی سند پر جائز قرار پا سکتے ہیں جو بلا تکلف اپنے شہریوں کو صرف اس لیے خفیہ یا علانیہ قتل کرواتی ہو کہ وہ اس کی ناروا کارروائیوں سے اختلاف کرتے یا ان پر تنقید کرتے ہیں، اور اس کے اشارے پر قتل جیسے جرم عظیم کا ارتکاب کرنے والوں کو الٹا تحفظ بہم پہنچاتی ہو کہ ان کے خلاف نہ پولیس کارروائی کرے نہ عدالت میں کوئی ثبوت اور شہادت پیش ہو سکے۔ ایسی حکومت کا تو وجود ہی ایک جرم ہے، کجا کہ اس کے حکم سے کسی انسان کے قتل پر قرآن کی اصطلاح "قتل بالحق" کا اطلاق ہو سکے۔

جان کے ساتھ مال کے تحفظ کا حق بھی اسلام نے پوری صراحت کے ساتھ دیا ہے، جیسا کہ ابھی میں حَجَّۃُ الوَدَاع کی تقریر کے حوالے سے بیان کر چکا ہوں۔ بلکہ قرآن مجید تو خدا کے قانون کے سوا کسی اور طریقے سے لوگوں کے مال لینے کو قطعی حرام قرار دیتا ہے۔ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔ "اور اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے نہ کھایا جایا کرو۔"

۲۔ عزت کا تحفظ دوسرا اہم حق ایک شہری کی عزت کا تحفظ ہے۔ حَجَّۃُ الوَدَاع کے جس خطبے کا میں ذکر کر چکا ہوں اس میں حضورؐ نے مسلمانوں کی صرف جان و مال ہی کو ایک دوسرے پر حرام قرار نہیں دیا تھا بلکہ ان کی عزت و آبرو (اَعْرَاضَكُمْ) کو بھی تاقیامت حرام ٹھیرایا تھا۔ قرآن مجید میں صاف حکم ہے کہ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ۔ "لوگ ایک دوسرے کا مذاق نہ اڑائیں، ایک دوسرے کی تضحیک نہ کریں"۔ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔ "اور تم آپس میں ایک دوسرے پر چوٹیں نہ کرو، پھبتیاں نہ کسو، الزام نہ دھرو، طعنے نہ دو، کھلم کھلا یا زیر لب یا اشاروں سے اس کی تذلیل نہ کرو"۔ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ۔ "ایک دوسرے کے برے نام نہ رکھو"۔ وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا۔ "اور تم میں سے کوئی کسی کے پیٹھ پیچھے اس کی برائی نہ کرے"۔ یہ ہے ہمارا قانون تحفظِ عزت اور یہ اہل مغرب کے قانون ہتک عزت (DEFAMATION) سے بدرجہا بہتر ہے۔ ہمارے قانون کی رُو سے اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ کسی

نے کسی شخص کی عزت پر حملہ کیا ہے تو قطعِ نظر اس سے کہ وہ مظلوم اپنے آپ کو عزت دار ثابت کرتا ہے یا نہیں، ظالم کو اس کی سزا بہر حال دی جائے گی۔ لیکن مغربی قانون کا کمال یہ ہے کہ ہتک عزت کا دعوٰے کرنے والے کو پہلے یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ وہ عزت والا ہے اور اِس بحث میں اُس غریب کی اُس سے زیادہ توہین و تذلیل ہوجاتی ہے جس کی فریاد لے کر وہ انصاف کا دروازہ کھٹکھٹانے گیا تھا۔ مزید برآں اسے چند ایسے گواہ بھی پیش کرنے پڑتے ہیں کہ ملزم کی توہین آمیز باتوں سے وہ واقعی اُنکی نگاہ میں ذلیل ہوگیا ہے۔ سبحان اللہ، کس غضب کی قانون دانی ہے یہ جسے خدا کے بنائے ہوئے قانون کے سامنے لایا جاتا ہے۔ اسلام تو بجائے خود کسی شخص کی توہین کو جرم قرار دیتا ہے خواہ وہ عزت والا ہو یا نہ ہو، اور خواہ توہین کرنے والے کی باتوں سے اس کی واقعی توہین ہوئی ہو یا نہیں۔ اسلامی قانون کی رو سے ملزم کے اِس فعل کا ثابت ہوجانا اُس کو مجرم قرار دینے کے لیے کافی ہے کہ اس نے ایسی بات کی ہے جو عقل عام (COMMON SENSE) کے لحاظ سے مستغیث کے لیے موجب توہین ہوسکتی ہے۔

۳۔ نجی زندگی کا تحفظ | اسلام اپنی مملکت کے ہر شہری کا یہ حق قرار دیتا ہے کہ اس کی نجی زندگی میں کوئی نا روا مداخلت نہ ہونے پائے۔ قرآن مجید کا حکم ہے کہ لَا تَجَسَّسُوْا۔ "ایک دوسرے کے حالات کا تجسس نہ کرو"۔ لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا۔ "لوگوں کے گھروں میں ان کی اجازت کے بغیر داخل نہ ہو"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک تاکید کی کہ آدمی خود اپنے گھر میں بھی اچانک نہ داخل ہو بلکہ کسی نہ کسی طرح اہل خانہ کو خبردار کر دے کہ وہ اندر آرہا ہے تاکہ ماں بہنوں، اور جوان بیٹیوں پر ایسی حالت میں نظر نہ پڑے جس میں نہ وہ اسے پسند کر سکتی ہیں کہ انہیں دیکھا جائے، نہ خود وہ شخص یہ پسند کرتا ہے کہ انہیں دیکھے۔ دوسروں کے گھر میں جھانکنے کی کوشش کرنا بھی سخت ممنوع ہے، حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو اپنے گھر میں جھانکتے ہوئے دیکھے اور اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔ حضورؐ نے دوسرے کا خط تک اُس کی اجازت کے بغیر پڑھنے سے منع فرمایا ہے، حتیٰ کہ اگر کوئی اپنا خط پڑھ رہا ہو اور دوسرا شخص جھانک کر اسے پڑھنے لگے تو یہ بھی سخت منع ہے۔ یہ ہے اسلام میں انسان کے تخلیے (PRIVACY) کا تقدس۔ اِدھر اس جدید تہذیب کے تحت ہماری دنیا کا حال یہ ہے کہ نہ صرف لوگوں کے خطوط پڑھے جاتے ہیں اور ان کو سنسر کیا جاتا ہے اور باقاعدہ ان کی فوٹوسٹیٹ کاپیاں بھی رکھ لی جاتی ہیں، بلکہ اب لوگوں کے گھروں میں ایسے آلات بھی لگائے جانے لگے ہیں جن کی مدد سے آپ دُور بیٹھے ہوئے یہ سُنتے رہیں

کو اس کے گھر میں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اب تخلیہ کوئی چیز نہیں ہے اور آدمی کی نجی زندگی کا عملاً خاتمہ کر دیا گیا ہے۔

اس تجسس کے لیے یہ کوئی اخلاقی جواز نہیں ہے کہ حکومت خطرناک آدمیوں کے رازوں سے واقف رہنا ضروری سمجھتی ہے۔ حالانکہ درحقیقت اس کی بنیاد وہ شک و شبہہ ہے جس سے آج کل کی حکومتیں اپنے ہر اس شہری کو دیکھتی ہیں جس میں وہ کچھ ذہانت اور سرکاری پالیسیوں پر عدم اطمینان کی بُو سونگھ لیتی ہیں۔ یہی چیز ہے جس کو اسلام سیاست میں فساد کی جڑ قرار دیتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اِنَّ الْاَمِیرَ اِذَا ابْتَغَی الرِّیبَةَ فِی النَّاسِ اَفْسَدَھُمْ۔ "حاکم وقت جب لوگوں کے اندر شبہات کے اسباب تلاش کرنے لگتا ہے تو ان کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے"۔ امیر معاویہ کا بیان ہے کہ انھوں نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اِنَّکَ اِنِ اتَّبَعْتَ عَوْرَاتِ النَّاسِ اَفْسَدْتَھُمْ اَوْ کِدْتَ اَنْ تُفْسِدَھُمْ۔ "تم اگر لوگوں کے مخفی حالات معلوم کرنے کے درپے ہوگے تو انھیں بگاڑ دو گے، یا کم از کم بگاڑ کے قریب پہنچا دو گے"۔ بگاڑنے کا مطلب یہ ہے کہ جب لوگوں کے راز ٹٹولنے کے لیے جاسوس (سی آئی ڈی کے آدمی) ہر طرف پھیلا دیے جاتے ہیں تو لوگ خود ایک دوسرے کو شبہہ کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں، حتیٰ کہ اپنے گھروں تک میں وہ کھل کر بات کرتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ معلوم اپنے ہی بچوں کی زبان سے کوئی بات ایسی نکل جائے جو ہم پر آفت لے آئے۔ اس طرح اپنے گھر تک میں زبان کھولنا آدمی کے لیے مشکل ہو جاتا ہے اور معاشرے میں ایک عام بے اعتمادی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

۴۔ شخصی آزادی کا تحفظ اسلام یہ اصول بھی طے کرتا ہے کہ کسی شخص کو اس کا جرم عدالت میں، اور وہ بھی کھلی عدالت میں، ثابت کیے بغیر قید نہیں کیا جاسکتا۔ محض شبہہ کی بنا پر پکڑنا، اور کسی عدالتی کارروائی کے بغیر اور صفائی کا موقع دیے بغیر قید کر دینا اسلام میں جائز نہیں ہے۔ حدیث میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ مسجد میں خطبہ دے رہے تھے۔ خطبے کے دوران میں ایک شخص نے اُٹھ کر کہا" یارسول اللہ میرے ہمسائے کس جرم میں پکڑے گئے ہیں؟ آپ نے سنا اور خطبہ جاری رکھا۔ اس نے پھر اُٹھ کر یہی سوال کیا۔ آپ نے پھر خطبہ جاری رکھا۔ اس نے تیسری بار پھر اُٹھ کر یہی سوال کیا۔ تب آپ نے حکم دیا کہ اس کے ہمسایوں کو چھوڑ دو۔ دو مرتبہ سن کر خاموش رہنے کی وجہ یہ تھی کہ کوتوال مسجد میں موجود تھا۔ اگر شخصِ مذکور کے ہمسایوں کو گرفتار کرنے کی کوئی خاص وجہ ہوتی تو وہ اُٹھ کر اسے بیان کرتا۔ جب اس نے کوئی وجہ بیان نہ کی تو حضورؐ

نے حکم دے دیا کہ جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا ہے انہیں چھوڑ دیا جائے۔ کوتوال اسلامی قانون سے واقف تھا۔ اس لیے اُس نے اُٹھ کر یہ نہیں کہا کہ "انتظامیہ اُن کے قصور سے واقف ہے اور علانیہ وہ قصور بیان نہیں کیا جاسکتا، حضور تخلیہ میں دریافت فرمائیں تو عرض کر دیا جائے گا۔" یہ بات اگر کوتوال زبان سے نکالتا تو اُسی وقت کھڑے کھڑے اُسے ملازمت سے برطرف کر دیا جاتا۔ عدالت کے لیے یہ بات بالکل کافی تھی کہ کوتوال نے گرفتاری کی کوئی وجہ کھلی عدالت میں پیش نہیں کی ہے، اس لیے فوراً رہائی کا حکم صادر کر دیا گیا۔ قرآن کا صاف حکم ہے کہ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ۔ "اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔" اور حضورؐ کو خود یہ حکم تھا کہ اُمِرْتُ اَنْ اَعْدِلَ بَيْنَكُمْ۔ "اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل کروں۔" اسی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ لَا يُؤْسَرُ رَجُلٌ فِي الْاِسْلَامِ اِلَّا بِالْعَدْلِ۔ "اسلام میں کوئی شخص عدل کے بغیر قید نہیں کیا جاسکتا۔"

یہ الفاظ خود بتا رہے ہیں کہ عدل سے مراد معقول عدالتی طریقہ کار (DUE PROCESS OF LAW) ہے، اور جس کی نفی کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ کسی شخص کو ثبوتِ جرم اور عدالت میں صفائی کا موقع دیے بغیر پکڑ کر قید کر دیا جائے۔ اگر حکومت کسی پر یہ شبہ رکھتی ہو کہ اس نے کوئی جرم کیا ہے یا وہ کوئی جرم کرنے والا ہے تو اسے عدالت کے سامنے اپنے شبہ کے وجوہ بیان کرنے چاہییں، اور ملزم یا مشتبہ آدمی کو کھلی عدالت میں اپنی صفائی پیش کرنی چاہیے تاکہ عدالت یہ فیصلہ کرسکے کہ اُس شخص پر شبہ کی کوئی معقول بنیاد ہے یا نہیں اور معقول بنیاد ہے تو اس کو جرم سے باز رکھنے کے لیے کتنی مدت تک قید رکھنا چاہیے۔ یہ فیصلہ لازماً کھلی عدالت میں ہونا چاہیے نہ کہ بند کمرے میں (IN CAMERA)، تاکہ حکومت کا الزام اور ملزم کی صفائی اور عدالت کی کارروائی دیکھ کر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اس کے ساتھ انصاف کیا جا رہا ہے، بے انصافی نہیں کی جارہی ہے۔

اس معاملہ میں اسلام کا طریقِ کار خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فیصلے سے معلوم ہوتا ہے۔ نہایت مشہور واقعہ ہے کہ فتح مکہ کے لیے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیاری فرما رہے تھے تو ایک صحابی حضرت حاطبؓ بن ابی بَلتعہ نے سردارانِ مکہ کے نام ایک خط لکھ کر انہیں اس تیاری کی اطلاع دے دی، اور وہ خط ایک عورت کے ہاتھ مکے بھیج دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوگیا۔ آپ نے حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ کو حکم دیا کہ جاؤ، فلاں مقام پر ایک عورت تم کو ملے گی۔ اُس کے پاس ایک خط ہے۔ وہ اس سے

حاصل کرکے لے آؤ۔ چنانچہ وہ گئے اور جو مقام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا تھا اُسی جگہ وہ عورت ملی۔ دونوں صاحبوں نے خط اس سے برآمد کرلیا اور لاکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر دیا۔ اب دیکھیے کھلی ہوئی غداری کا مسئلہ تھا۔ جنگ کے زمانے میں دشمن کو اپنی فوج کے ایک اہم راز کی خبر دے دینا اور دشمنوں کو حملے کی خبر قبل از وقت بھیج دینا ایسا فعل تھا جس سے زیادہ خطرناک فعل کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اِس سے زیادہ بند کمرے میں سماعت کے لیے اور کونسا مقدمہ موزوں ہوسکتا تھا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی کی کھلی عدالت میں سینکڑوں حاضرین کے سامنے حضرت حاطِبؓ کو بلاکر ان سے باز پرس کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اسلام سے باغی نہیں ہوا ہوں۔ غدّاری کی نیت سے یہ کام میں نہیں کر بیٹھا ہوں۔ دراصل میرے بال بچے وہاں ہیں اور مکّے میں کوئی میرا قبیلہ نہیں ہے جو میرے بال بچوں کی حمایت کرے، اس لیے میں نے یہ خط لکھا تاکہ اہل مکہ میرا احسان مان کر میرے بال بچوں کے ساتھ زیادتی نہ کریں۔ حضرت عمرؓ اُٹھ کر عرض کرتے ہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اجازت دیجیے کہ اِس غدّار کو قتل کر دوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں یہ اہلِ بدر میں سے ہیں۔ اور اِنہوں نے اپنے فعل کی جو وجہ بیان کی ہے وہ واقعہ کے مطابق ہے۔ حضورؐ کے اِس فیصلے پر غور کیجیے فعل صریح غدّاری کا تھا۔ مگر آپ دو باتوں کی وجہ سے حضرت حاطِب کو بَری کر دیتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کا ماضی بتا رہا ہے کہ وہ اسلام کے غدّار نہیں ہوسکتے، کیونکہ انہوں نے جنگِ بدر جیسے نازک موقع پر اپنا سینہ خطرات کے آگے پیش کیا تھا۔ دوسرے یہ کہ مکّے میں ان کے بال بچے واقعی خطرے میں تھے، اس لیے اگر ان سے یہ کمزوری سرزد ہوئی ہے تو اس کی یہ سزا کافی ہے کہ سب کے سامنے ان کا راز کھل گیا اور اسلام کے وفاداروں کی نگاہ میں ان کی بے عزتی ہوگئی۔ قرآن مجید میں بھی حضرت حاطب کے اس واقعہ کا اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے، مگر زجر و توبیخ کے سوا ان کے لیے کوئی سزا تجویز نہیں کی گئی ہے۔

حضرت علیؓ کے زمانے میں خارجیوں کا طرزِ عمل جیسا کچھ تھا وہ تاریخ کے طالب علموں سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ وہ علانیہ آپ کو گالیاں دیتے تھے۔ قتل تک کر دینے کی آپ کو دھمکیاں دیتے تھے۔ مگر اِن باتوں پر جب کبھی انہیں پکڑا گیا آپ نے انہیں چھوڑ دیا، اور اپنی حکومت کے افسروں سے فرمایا کہ "جب تک وہ باغیانہ کارروائیاں نہیں کرتے محض زبانی مخالفت اور دھمکیاں ایسی چیز نہیں ہیں جن کی وجہ سے ان پر ہاتھ ڈالا جائے"۔ امام ابوحنیفہ امیر المومنین کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ ما لم یعزموا علی الخروج فالامام

لَا یَتَعَرَّضُ لَهُمْ "جب تک وہ خروج (مسلح بغاوت) کا عزم نہیں کرتے خلیفہ وقت ان سے تعرض نہ کرے گا"۔ ایک اور موقع پر حضرت علیؓ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ خارجیوں نے اپنا مخصوص نعرہ دوران خطبہ بلند کیا۔ آپ نے اس پر فرمایا لَنْ تَمْنَعَكُمْ مساجد الله أن تذكروا فيها اسم الله ولن نمنعكم الفئ ما دامت أيديكم مع أيدينا ولن نقاتلكم حتى تقاتلونا۔ "ہم تمہیں مسجدوں میں آکر اللہ کو یاد کرنے سے نہ روکیں گے اور حکومت کے مال میں سے تمہارا حق دینا بھی بند نہ کریں گے جب تک تمہارے ہاتھ ہمارے ہاتھوں کے ساتھ ہیں (یعنی جب تک تم دشمنانِ اسلام کے خلاف لڑنے میں ہمارا ساتھ دیتے ہو) اور ہم تم سے ہرگز جنگ نہ کریں گے جب تک تم ہم سے جنگ نہیں کرتے"۔ اب دیکھیے جس اپوزیشن سے حضرت علیؓ کو سابقہ درپیش تھا، ایک جمہوری نظام میں اُس سے زیادہ سخت اپوزیشن کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس کے مقابلے میں جو آزادی انہوں نے دے رکھی تھی کسی حکومت نے ایسی آزادی اپوزیشن کو نہیں دی۔ انہوں نے قتل کی دھمکیاں دینے والوں کو بھی نہ گرفتار کیا اور نہ کسی کو جیل بھیجا۔

۵- ظلم کے خلاف آواز اُٹھانے کا حق

اسلام کے دیے ہوئے حقوق میں سے ایک ظلم کے خلاف آواز اُٹھانے کا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ۔ "اللہ کو بُرائی کے ساتھ آواز بلند کرنا پسند نہیں ہے سوائے اس شخص کے جس پر ظلم کیا گیا ہو"۔ یعنی اللہ بُرائی پر زبان کھولنے کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ لیکن جس شخص پر ظلم کیا گیا ہو اس کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ علی الاعلان ظلم کے خلاف آواز اُٹھائے۔ یہ حق صرف افراد ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ آیت کے الفاظ عام ہیں۔ اس لیے اگر کوئی شخص نہیں بلکہ کوئی جماعت یا گروہ اقتدار پر غلبہ حاصل کرکے افراد، یا جماعتوں یا ملک کی پوری آبادی پر ظلم ڈھانے لگے تو اُن کے خلاف برسرِعام صدائے احتجاج بلند کرنا خدا کا دیا ہوا حق ہے، اور اس حق کو سلب کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ اب اگر کوئی اللہ کے دیے ہوئے اِس حق کو سلب کرتا ہے تو وہ اللہ کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ دفعہ ۱۴۴ کا تعویذ اُسے دنیا میں چاہے بچالے جائے، اللہ کی دوزخ سے بچانا اُس کی کرامتوں میں شامل نہیں ہے۔

۶- آزادئ اظہارِ رائے کا حق

مملکتِ اسلامیہ کے تمام شہریوں کو اسلام آزادی اظہارِ رائے کا حق اس شرط کے ساتھ دیتا ہے کہ وہ بھلائی پھیلانے کے لیے ہو نہ کہ بُرائی پھیلانے کے لیے۔ اظہارِ رائے کی آزادی کا یہ اسلامی تصور موجودہ مغربی تصور سے بدرجہا بلند ہے۔ بُرائی پھیلانے کی آزادی اسلام نہیں دیتا۔ تنقید کے

نام سے دشنام طرازی کی بھی وہ اجازت نہیں دیتا۔ البتہ اُس کے نزدیک بھلائی پھیلانے کے لیے اظہارِ رائے کا حق صرف حق ہی نہیں بلکہ مسلمان پر ایک فرض بھی ہے جسے روکنا خدائے ذوالجلال سے لڑائی مول لینا ہے۔ اور یہی معاملہ بُرائی سے منع کرنے کا بھی ہے۔ بُرائی خواہ کوئی شخص کر رہا ہو یا کوئی گروہ، خود اپنے ملک کی حکومت کر رہی ہو یا کسی دوسرے ملک کی، اپنی قوم کر رہی ہو، یا دنیا کی کوئی دوسری قوم، مسلمان کا حق ہے اور یہ اس کا فرض بھی ہے کہ اسے ٹوکے، اس سے روکے، اور اس کے خلاف علی الاعلان اظہار ناراضی کر کے یہ بتائے کہ بھلائی کیا ہے جسے اُس فرد، یا قوم، یا حکومت کو اختیار کرنا چاہیے۔

قرآن مجید میں مومنوں کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ یَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ "وہ بھلائی کے لیے کہنے والے اور بُرائی سے روکنے والے ہوتے ہیں"۔ اس کے برعکس منافقوں کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ یَأْمُرُوْنَ بِالْمُنْکَرِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ "وہ بُرائی کے لیے کہنے والے اور بھلائی سے روکنے والے ہوتے ہیں"۔ اہل ایمان کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ان کی حکومت کا مقصد وجود ہی یہ ہے اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ۔ "ان کو اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، بھلائی کا حکم دیں گے اور بُرائی سے منع کریں گے"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص بُرائی کو دیکھے تو ہاتھ سے روکے، اگر ہاتھ سے نہیں روک سکتا تو زبان سے روکے، اگر زبان سے بھی نہیں روک سکتا تو دل سے روکے (یعنی کم از کم دل سے اسے بُرا سمجھے) اور یہ آخری درجہ ہے ایمان کا۔ اس کے بعد ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔ یہ ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی حیثیت۔ اگر کوئی حکومت لوگوں سے یہ حق چھینتی ہے اور انہیں یہ فرض ادا کرنے نہیں دیتی تو وہ براہِ راست خدا کے حکم سے ٹکرا رہی ہے۔ اس کا تصادم ہم سے نہیں ہے، اس کا تصادم خدا سے ہے، وہ خدا کے مقابلے میں برسرِ جنگ ہے اور اُس حق کو چھین رہی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے صرف حق ہی نہیں، فرض قرار دیا ہے اور اس کا حکم دیا ہے۔ رہی وہ حکومت جو بُرائیوں کو پھیلاتی اور پھیلنے دیتی ہے، اور بھلائی کی طرف دعوت دینے والوں کی مزاحمت کرتی ہے، تو وہ از روئے قرآن منافقوں کی حکومت ہے۔

۷۔ آزادیِ اجتماع کا حق اجتماع اور جماعت سازی کا حق بھی اسلام نے لوگوں کو دیا ہے مگر وہ بھی اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ بھلائی پھیلانے کے لیے ہو، بُرائی پھیلانے کے لیے نہ ہو۔ اس نوعیت کے اجتماع

اور اس قسم کی جماعت سازی کا صرف حق ہی نہیں بلکہ اس کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ۔ "تم وہ بہترین امت ہو جسے لوگوں (کی اصلاح) کے لیے نکالا گیا ہے۔ تم نیکی کے لیے کہتے ہو اور برائیوں سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔" یعنی پوری کی پوری مسلمان امت ہی کا یہ کام ہے کہ وہ بھلائی کے لیے لوگوں سے کہے اور برائی سے روکے۔ لیکن اگر سب مسلمان ایسے نہ ہوں تو کم از کم وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ "تم میں ایک گروہ تو ایسا ہونا ہی چاہیے جو نیکی کی طرف بلائے بھلائی کے لیے کہے اور بدی سے روکے۔ اور ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔" اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان قوم اگر مجموعی طور پر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضے سے غافل بھی ہو جائے تو ان میں ایسے ایک گروہ کا موجود رہنا ضروری ہے جو بھلائی پھیلانے، برائی سے روکنے اور خیر کی طرف دعوت دینے کی خدمت انجام دے۔ یہ حق ہی نہیں، فرض ہے جس کے ادا کرنے پر فلاح کا انحصار ہے۔ لیکن خدا کے دین کے ساتھ یہ عجیب مذاق ہے کہ مسلمانوں کے ملک میں برائی پھیلانے کے لیے جو اجتماع اور جماعت سازی ہو وہ تو حکومت کرنے کا حق رکھے اور بھلائی پھیلانے کے لیے جو جماعت سازی ہو وہ ہر وقت خطرے میں مبتلا رہے کہ نہ معلوم کب اس پر ہاتھ ڈال دیا جائے۔ یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور یہ ریاست اسلامی ہے۔ لیکن ہو رہا ہے امر بالمنکر اور نہی عن المعروف۔ اور جینا دشوار کیا جا رہا اُن لوگوں کے لیے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

۸۔ ضمیر واعتقاد کی آزادی کا حق | اسلام اپنے معاشرے اور اپنی مملکت میں لوگوں کو ضمیر واعتقاد کی آزادی کا حق بھی دیتا ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ۔ "دین میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔" اگرچہ دینِ حق سے بڑی کوئی نیکی نہیں ہے اور مسلمان اس کی طرف دعوت ضرور دیں گے اور اس کی حقانیت دلائل سے ثابت بھی کریں گے، مگر یہ نیکی لوگوں پر زبردستی مسلط نہیں کی جائے گی۔ جو شخص اس کو مانے تو اپنی مرضی سے مانے۔ ہم اسے سینے سے لگائیں گے اور اپنے معاشرے میں بالکل مساویانہ حقوق کے ساتھ شامل کریں گے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس کو نہ مانے تو ہم اس کا یہ حق بھی تسلیم کریں گے کہ وہ اس کو نہ مانے۔ کوئی جبر اس پر نہیں کیا جائے گا۔

۹۔ مذہبی دل آزاری سے تحفظ کا حق | آزادی اعتقاد و آزادی ضمیر کے ساتھ اسلام نے لوگوں کو یہ حق بھی دیا ہے کہ ان کی مذہبی دلآزاری نہ کی جائے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔" جن معبودوں کو یہ مشرکین اللہ کے سوا پکارتے ہیں ان کو گالیاں نہ دو"۔ یہ معاملہ صرف بتوں اور معبودوں ہی کی حد تک خاص نہیں ہے، بلکہ کسی قوم کے بزرگوں اور پیشواؤں کے لیے بھی یہی حکم ہے۔ اسلام اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ ایک گروہ اگر آپ کے نزدیک بُرا عقیدہ رکھتا ہے، اور اُن لوگوں کو اپنا بزرگ مانتا ہے جو آپ کے نزدیک بزرگی کے مستحق نہیں ہیں، تو آپ ان کو گالیاں دینے لگیں اور اپنی اِس بیہودہ حرکت سے اُن کے ماننے والوں کا دل دُکھائیں۔ مذہبی مسائل میں بحث مباحثہ کرنے سے اسلام نہیں روکتا۔ مگر وہ چاہتا ہے کہ یہ تہذیب و شائستگی کے ساتھ ہو۔ وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۔" اہل کتاب سے مباحثہ نہ کرو مگر احسن طریق سے"۔ یہ حکم صرف اہل کتاب ہی کے لیے نہیں ہے، بلکہ سب اہل مذاہب کے لیے ہے۔

۱۰۔ یہ حق کہ ایک کے قصور میں دوسرا نہ پکڑا جائے | اسلام انسان کا یہ حق بھی قرار دیتا ہے کہ وہ دوسروں کے قصور میں نہ دھر لیا جائے۔ قرآن مجید میں یہ عام اصول بیان کیا گیا ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۔ "کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھاتا"۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے فعل کا خود ذمہ دار ہے۔ دوسرے کسی شخص کا اگر اس کے فعل میں کوئی حصہ نہیں ہے تو اس کی ذمہ داری میں وہ نہیں پکڑا جا سکتا۔ افسوس کہ اس صریح منصفانہ اور معقول قاعدے کو بھی، جو کسی انسان کا گھڑا ہوا نہیں بلکہ رب کائنات کا مقرر کردہ ہے، ہم پامال ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ قصور وار ایک شخص ہے اور پکڑی جا رہی ہے اس کی بیوی۔ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ کراچی میں ایک شخص پر شبہہ کیا گیا کہ وہ ایک بم کیس میں ملوّث ہے۔ تفتیش کے لیے اسے پکڑ کر سخت اذیتیں دی گئیں کہ وہ اس جرم کا اعتراف کرے۔ جب اس نے کہا کہ میں بالکل بے قصور ہوں تو اس کی ماں اس کی بیوی اس کی بیٹی اس کی بہن سب کو پکڑ لایا گیا، اُس کے سامنے اُن کو اور اُن کے سامنے اُس شخص کو برہنہ کیا گیا تاکہ وہ اعترافِ جرم کرے۔ گویا اب تفتیش جرائم کے لیے یہ بھی جائز ہو گیا کہ مشتبہ شخص پر دباؤ ڈالنے کے لیے اس کے گھر کی بے قصور خواتین کو ننگا کیا جائے۔ یہ سخت شرمناک ہے۔ کمینہ پن کی انتہا ہے۔ میں یہ ہوائی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ مجھے اس واقعہ کا علم ہے اور میں اسے ثابت کر سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایسے ظالموں کو کیا حق ہے کہ وہ کہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور ہم اسلام کے مطابق حکمرانی کر رہے ہیں اور

ہماری ریاست اسلامی ہے۔ قرآن کے ایک صریح قاعدے کو توڑ رہے ہو، مردوں اور عورتوں کو برہنہ کرتے ہو جو اسلام میں قطعی حرام ہے، انسانیت کی مٹی پلید کرتے ہو اور پھر کہتے ہو کہ ہم مسلمان ہیں۔

۱۱۔ ہر حاجت مند کا یہ حق ہے کہ اس کی مدد کی جائے | اسلام میں حاجت مند لوگوں کا یہ حق قرار دیا گیا ہے کہ اُن کی دستگیری کی جائے۔ وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ "مسلمانوں کے مال میں حق ہے ہر اُس شخص کا جو مدد مانگے اور ہر اُس شخص کا جو محروم ہو"۔ اِس آیت میں صرف مدد مانگنے والے ہی کا حق مسلمان کے مال میں قرار نہیں دیا گیا ہے بلکہ یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ اگر تمہارے علم میں یہ بات آئے کہ فلاں شخص اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہ گیا ہے تو قطع نظر اس سے کہ وہ مانگے یا نہ مانگے، تمہارا کام یہ ہے کہ خود اس تک پہنچو اور اس کی مدد کرو۔ اس غرض کے لیے صرف رضاکارانہ انفاق فی سبیل اللہ پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ زکوٰۃ بھی فرض کر دی گئی ہے اور اس کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَآئِهِمْ فَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَآئِهِمْ۔ "وہ مسلمانوں کے مال داروں سے لی جاتی ہے اور ان کے غریبوں پر صرف کی جاتی ہے"۔ اس کے ساتھ اسلامی حکومت کی بھی یہ ذمہ داری قرار دی گئی ہے کہ جس کا کوئی دستگیر نہ ہو اس کی دستگیری وہ کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اَلسُّلْطَانُ وَلِيُّ مَنْ لَّا وَلِيَّ لَهٗ۔ "حکمران اُس کا ولی ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو"۔ یہ ولی کا لفظ بہت وسیع معنی رکھتا ہے۔ کوئی یتیم، کوئی بوڑھا، کوئی اپاہج، کوئی بیروزگار، کوئی مریض اگر اس حالت میں ہو کہ دنیا میں اس کا کوئی سہارا نہ ہو، تو حکومت کو اس کے لیے سہارا بننا چاہیے۔ اگر کوئی میت ایسی ہو جس کا کوئی ولی و وارث نہ ہو تو اُس کا جنازہ اُٹھانا اور اس کی تجہیز و تکفین کا انتظام کرنا حکومت کے ذمّے ہے۔ غرض، یہ دراصل ایک ولایتِ عامّہ ہے جس کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر عائد ہوتی ہے۔

۱۲۔ قانون کی نگاہ میں مساوات کا حق | اسلام اپنی مملکت کے تمام شہریوں کو قانون کی نگاہ میں مساوات کا حق دیتا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کے بارے میں تو قرآن اور حدیث میں یہ صاف وضاحت ہے کہ اپنے حقوق اور واجبات میں وہ سب برابر ہیں۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ "مومن تو آپس میں بھائی ہیں"۔ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ "اگر (غیر مسلم) کفر سے توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اَلْمُسْلِمُوْنَ تَتَكَافَاُ دِمَاؤُهُمْ۔ "مسلمانوں کے خون برابر کی قدر و قیمت رکھتے ہیں"۔ دوسری حدیث میں ہے ذِمَّةُ الْمُسْلِمِيْنَ وَاحِدَةٌ يَّسْعٰى بِهَا اَدْنَاهُمْ "سب مسلمانوں کا ذمہ ایک ہی ہے۔ ان کا

ایک ادنیٰ شخص بھی کسی کو پناہ یا امان دے سکتا ہے۔" ایک اور مفصل حدیث میں حضورؐ فرماتے ہیں کہ جو لوگ اللہ کی وحدانیت اور اس کے رسول کی رسالت مان لیں، اور ہر قسم کے تعصبات چھوڑ کر ملّتِ اسلام میں شامل ہو جائیں، ان کے حقوق وہی ہیں جو مسلمانوں کے حقوق ہیں اور ان کے فرائض بھی وہی ہیں جو مسلمانوں کے فرائض ہیں (لَهُمْ مَا لِلْمُسْلِمِيْنَ وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ)۔ یہ دینی بھائی چارہ، اور حقوق و فرائض کی یکسانی اسلامی معاشرے میں مساوات کی بنیاد ہے اور اس میں کسی کے حقوق و فرائض کسی دوسرے کے حقوق و فرائض سے کسی معنی میں بھی کم یا زیادہ نہیں ہیں۔ رہے اسلامی حکومت کے غیر مسلم شہری، تو ان کے بارے میں اسلامی شریعت کا قاعدہ خلیفۂ برحق حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "انہوں نے ہمارا ذمہ قبول ہی اس لیے کیا ہے کہ ان کے خون ہمارے خون کی طرح اور ان کے مال ہمارے مال کی طرح ہو جائیں۔ (لِتَكُوْنَ اَمْوَالُهُمْ كَاَمْوَالِنَا وَدِمَاءُهُمْ كَدِمَاءِنَا)۔ بالفاظِ دیگر ان کی جان و مال کی حرمت بھی اسلامی مملکت میں ویسی ہی ہے جیسی مسلمان کی جان و مال کی حرمت ہے۔ قرآن مجید فرعون کے بدترین جرائم میں اس جرم کو بھی شمار کرتا ہے کہ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا۔" اس نے ملک کے باشندوں کو الگ الگ طبقوں میں بانٹ دیا تھا"۔ اور يَسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ۔ "وہ ان میں سے ایک گروہ کو دبا کر رکھتا تھا"۔

۱۳۔ حاکموں کا قانون سے بالاتر نہ ہونا اسلام صریح طور پر یہ تقاضا کرتا ہے چھوٹے سے لے کر بڑے تک تمام حکام، حتیٰ کہ صدرِ مملکت بھی قانون کی نگاہ میں عام شہریوں کی طرح ہوں، کوئی قانون سے بالاتر نہ ہو اور کسی بڑی سے بڑی شخصیت کے مقابلے میں بھی ایک عام شہری اپنے حق کا دعویٰ لے کر اٹھ سکے۔ حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ "میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ذات سے بدلہ دیتے دیکھا ہے"۔ جنگِ بدر کا واقعہ ہے کہ حضورؐ اسلامی فوج کی صفیں سیدھی کرا رہے تھے۔ ہاتھ میں ایک لکڑی تھی۔ اتفاق سے آگے بڑھے ہوئے ایک سپاہی کو پیچھے ہٹاتے ہوئے آپ کی لکڑی اس کے پیٹ میں چبھ گئی۔ اس نے کہا کہ آپ نے مجھے تکلیف دی۔ آپ نے فوراً اپنا پیٹ کھول دیا کہ تو بھی لکڑی میرے پیٹ میں چبھو دے۔ اس نے بڑھ کر آپ کا شکم مبارک چوم لیا اور عرض کیا کہ میں یہی چاہتا تھا۔ چوری کے ایک مقدمے میں ایک خاندانی عورت ماخوذ ہوئی۔ سفارش کی گئی کہ اسے سرقہ کی حد سے معاف کر دیا جائے۔ حضورؐ نے جواب دیا تم سے پہلے کی قومیں اسی لیے برباد ہوئیں کہ وہ عام لوگوں پر حدیں جاری کرتی تھیں اور معززین کو معاف کر دیتی تھیں۔ وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَوْ اَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ فَعَلَتْ ذٰلِكَ لَقَطَعْتُ يَدَهَا" اس

ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی فاطمہؓ بھی یہ فعل کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔" حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں مصر کے گورنر حضرت عمروؓ بن العاص کے بیٹے محمد نے ایک مصری کو کوڑے سے مار دیے۔ اُس مصری نے مدینے جا کر خلیفۂ برحق سے شکایت کر دی تو انہوں نے مصر کے گورنر اور ان کے بیٹے محمد کو فوراً طلب کر لیا۔ اور جب وہ حاضر ہوئے تو مصری کے ہاتھ میں دُرّہ دے کر حکم دیا کہ گورنر کے بیٹے کو اُن کے سامنے مارے۔ پھر جب وہ اپنا بدلہ لے کر دُرّہ حضرت عمرؓ کو واپس دینے لگا تو آپ نے اُس سے کہا: "ایک ضرب ان گورنر صاحب کے بھی لگا۔ خدا کی قسم ان کا بیٹا تجھے ہرگز نہ مارتا اگر اُسے اپنے باپ کا غرّہ نہ ہوتا۔" مستغیث نے عرض کیا کہ "جس نے مجھے مارا تھا اس سے میں بدلہ لے چکا ہوں۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا: "خدا کی قسم اگر تو انہیں مارتا تو میں حائل نہ ہوتا۔ تو نے خود ہی انہیں چھوڑ دیا ہے۔" پھر غضبناک ہو کر حضرت عمروؓ بن عاص کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا اَبَا عَمْرو مَتٰی تَعَبَّدْتُمُ النَّاسَ وَقَدْ وَلَدَتْهُمْ اُمَّهَاتُهُمْ اَحْرَارًا "اے عمرو، تم نے کب سے لوگوں کو اپنا غلام بنا لیا حالانکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا۔" اسلامی حکومت جب اپنی اصلی شان میں قائم تھی تو اس زمانے میں حالت یہ تھی کہ خود خلیفۂ وقت کے خلاف بھی دعوے کیے جاتے تھے اور اسے عدالت میں حاضر ہونا پڑتا تھا اور خلیفہ کو اگر کسی کے خلاف شکایت ہوتی تھی تو وہ اپنے انتظامی اختیارات سے کام لے کر اپنی شکایت خود رفع نہیں کر لیتا تھا بلکہ عدالت سے رجوع کرتا تھا۔

۱۴۔ معصیت سے اجتناب کا حق اسلام اپنی مملکت میں ہر شہری کو یہ حق بھی دیتا ہے کہ اسے کسی معصیت (گناہ یا جرم کرنے) کا حکم نہ دیا جائے، اور کوئی حکومت یا حاکم یا اُس شخص کا افسرِ بالا اُسے ایسا کوئی حکم دے تو وہ اُس کی اطاعت سے انکار کر دے۔ اُس کا انکار قانونِ اسلامی کی نگاہ میں جرم نہیں ہے۔ بلکہ معصیت کا حکم دینا جرم ہے جس پر خود وہ حاکم ماخوذ ہونے کے قابل ہے جس نے معصیت کا حکم دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ واضح ارشاد حدیث میں موجود ہے کہ لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ۔ "خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہے۔" اس قاعدے کی رُو سے کسی جرم کا ارتکاب کرنے والا شخص عدالت میں یہ عذر پیش نہیں کر سکتا کہ میں نے یہ جرم حاکمِ وقت یا اپنے افسرِ بالا کے حکم سے کیا ہے۔ اگر ایسی کوئی صورت پیش آئے تو جرم کرنے والا اور جرم کا حکم دینے والا، دونوں قابلِ مواخذہ ہوں گے، اور اگر اطاعت سے انکار کی بنا پر کوئی حاکم اپنے ماتحت کے خلاف کسی قسم کی ناروا کارروائی کرے تو وہ عدالت سے رجوع کر کے اپنے حقوق

کا تحفظ بھی کرا سکتا ہے اور ایسے غلط کار حاکم کو سزا بھی دلوا سکتا ہے۔

۱۵۔ حکومت کے کام میں شرکت کا حق | اسلام کی رو سے دنیا میں انسانی حکومت دراصل خداوندِ عالم کی خلافت ہے، اور یہ خلافت کسی شخص یا خاندان یا طبقے یا جماعت کو نہیں بلکہ پوری ملتِ اسلامیہ کو عطا کی جاتی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ۔ "اللہ نے وعدہ کیا ہے اُن لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں کہ وہ انہیں زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا"۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خلافت اجتماعی ہے جس میں ہر بندۂ مسلم کا حصّہ دوسرے کسی مسلمان سے کم ہے نہ زیادہ۔ اس مشترک خلافت کے نظام کو چلانے کے لیے جو عملی صورت قرآن مجید میں تجویز کی گئی ہے وہ ہے وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ "مسلمانوں کا کام آپس کے مشورے سے چلتا ہے"۔ اس اصول کے مطابق ہر مسلمان کا یہ حق ہے کہ حکومت کا کام چلانے میں یا تو اُس کا مشورہ براہِ راست شریک ہو یا پھر اُس مشورے میں بالواسطہ طریقہ سے اُس کا چُنا ہوا نمائندہ حصّہ لے۔ اسلام اِس کو قطعاً جائز نہیں رکھتا کہ کوئی شخص، یا اشخاص کا کوئی ٹولہ عامۃ المسلمین کو بے دخل کر کے حکومت کے اختیارات خود سنبھال بیٹھے۔ اور اسلام اِس کو بھی صحیح نہیں سمجھتا کہ کوئی حاکم شورٰی کا محض ڈھونگ رچا کر لالچ، فریب، جبر اور دھاندلیوں سے خود منتخب ہو جائے اور مجلس شورٰی میں اپنی مرضی کے آدمیوں کو منتخب کرا لے۔ یہ خلق ہی کے سامنے نہیں بلکہ اُس خالق کے سامنے بھی غدّاری ہے جس نے مسلمانوں کو خلافت کے اختیارات دیے ہیں، اور ان اختیارات کو استعمال کرنے کے لیے شورٰی کا طریقہ مقرر فرمایا ہے۔ شورٰی کا کوئی مفہوم اِس کے سوا نہیں ہے کہ (۱) حاکم اور اس کو مشورے دینے والے نمائندے لوگوں کی آزادانہ مرضی سے منتخب ہوں۔ (۲) لوگوں کو اور ان کے نمائندوں کو تنقید، اختلاف اور اظہار رائے کی آزادی ہو۔ (۳) عوام کے سامنے ملک کے حالات بے کم و کاست آئیں تاکہ وہ یہ رائے قائم کر سکیں کہ حکومت ٹھیک کام کر رہی ہے یا نہیں اور (۴) اس امر کی پوری ضمانت موجود ہو کہ حکومت وہی کرے جسے لوگ پسند کریں، اور وہ شخص منصب اقتدار سے ہٹا دیا جائے جسے لوگ ناپسند کریں۔

خلاصۂ کلام | حضرات، یہ ہے ایک مختصر نقشہ ان حقوق کا جو آج سے چودہ سو برس پہلے اسلام نے انسان کو، برسر جنگ لوگوں کو، اور اپنی مملکت کے شہریوں کو دیے تھے، اور جو ہمیشہ کے لیے ہر صاحب ایمان مسلمان کے لیے قانون کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ اس سے اگر ایک طرف یہ معلوم کر کے ایمان تازہ ہوتا ہے کہ ترقی و

(باقی بر صفحہ ۴۸)

رسائل و مسائل

سیلِ عرم کا زمانہ

سوال:- ۱- تفہیم القرآن میں آپ نے سیل عرم کا جو زمانہ ۴۵۰ء متعین فرمایا ہے اس کے بارے میں یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں (یعنی ان کا ماخذ کیا ہے)۔

۲- "ارض القرآن" کی اشاعت سے پہلے بھی ۴۵۰ء والی روایت بعض کتابوں میں ملتی ہے اس لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ارض القرآن کی اشاعت کے بعد یہ بات ثابت ہوئی کہ سیلِ عرم ۴۵۰ء میں آیا۔ نکلسن کی تاریخ ادب العرب میں بھی سیلِ عرم کا زمانہ ۴۴۷ء یا ۴۵۰ء لکھا ہے لیکن یہ روایت بوجوہ محل نظر ہے۔

۳- قرآن حکیم کی مختلف تفاسیر (بشمول تفہیم القرآن) کا بغور مطالعہ کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کہ جس سیلِ عرم کا ذکر قرآن مجید میں ہے اس کا تعلق سبا کے طبقہ ثانیہ سے ہے نہ کہ سبائے حمیر سے جن کو قومِ تُبَّعَ کہا گیا ہے۔ اسی طرح "تفرقِ سبا" کا واقعہ بھی ولادتِ مسیح سے پہلے ہوا نہ کہ بعد میں۔

۴- سیل عرم کے نتیجہ میں سدِ مارب ٹوٹ گیا اور سبا کے باغ اجڑ گئے۔ اس کے معاً بعد (تجارتی راستوں پر دوسری اقوام کے غلبے کی وجہ سے) ان کے قبائل کا شیرازہ بکھر گیا۔

۵- اگر سیل عرم کا زمانہ ۴۵۰ء تسلیم کیا جائے تو "تفرقِ سبا" بھی اس کے بعد ہونا چاہیے۔ لیکن عرب (اور بالخصوص مدینۂ منورہ) کی مختلف تواریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سبا کے مختلف قبائل ۴۵۰ء سے کہیں پہلے سارے عرب میں منتشر ہو گئے تھے۔ مشہور تاریخی واقعہ ہے کہ ان کا قبیلہ ازد یا اسد جو یثرب میں آکر آباد ہو گیا تھا اس پر یہودی سردار فیطون (یا فطیون) نے بے پناہ مظالم ڈھائے۔ غسانی سردار ابوجبیلہ نے ان مظالم کا انتقام لیا۔ اس واقعہ کے بعد مشہور تبع ابوکرب اسعد

یا حسان بن کلیکرب کا ورود یثرب میں ہوا۔ (ابوکرب اسعد کا زمانۂ حکومت ۴۰۰ء تا ۴۲۵ء ہے۔ اور حسان کا ۴۲۵ء تا ۴۵۵ء)۔ عرب مؤرخین نے تبابعہ کے حالات غلط یا صحیح تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں لیکن کسی نے یہ نہیں لکھا کہ سیل عرم تبابعہ کے عہد میں آیا۔ اگر سیل عرم کا زمانہ ۴۵۰ء مانا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ قبائلِ سبا کا شیرازہ ۴۵۰ء کے بعد منتشر ہوا۔ حالانکہ تاریخ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ سبا کے تجارتی راستوں پر بہت پہلے دوسروں کا غلبہ ہوگیا تھا اور یہی بات ان کے انتشار کا باعث ہوئی تھی۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ ان منتشر قبائل میں سے بعض نے پھر عروج حاصل کر لیا۔ یہ بھی درست ہے کہ سیلِ عرم کا "تفرقِ قبائل" سے براہ راست تعلق نہیں ہے۔ لیکن سورۂ سبا میں جس سیل عرم کا ذکر ہے اس کے سیاق وسباق سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا تعلق سبا کے طبقۂ ثانیہ سے ہے جس کا دور عروج ۱۱۵ ق م میں ختم ہوگیا۔ سدِ مارب بلاشبہ اس کے بعد بھی کام دیتا رہا (اس کی مرمت کس نے کرائی؟ تاریخ اس کے بارے میں خاموش ہے) لیکن وہ باغ جنہیں "جنّتین" کہا گیا ہے پھر معرضِ وجود میں نہ آسکے۔ سدِ مارب تو سبائے حمیر کے عہد میں اور ان کے زوال کے بعد بھی کام دیتا رہا۔ ۵۴۳ء میں یہ ایک بار پھر ٹوٹا تو ابرہہ نے اس کی مرمت کروائی۔ آخری بار یہ کب ٹوٹا؟ اس کے متعلق بھی مختلف روایتیں ہیں۔

۶۔ تمام مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سبا کے طبقۂ اولیٰ (اور ثانیہ) کا مسکن شہر "مارب" (سبا) تھا اور "سیلِ عرم" کا تعلق اسی بند سے ہے جو مارب کے متصل تعمیر کیا گیا تھا۔ سبائے حمیر کا مسکن مارب نہیں تھا اس لیے قرآن کریم کے بیان کردہ "سیلِ عرم" کا تعلق یقیناً سبائے حمیر کے زمانے سے نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ حمیر نے اپنی حکومت کو مارب تک وسعت دے لی تھی لیکن مارب کو حمیر کا مسکن نہیں کہا جاسکتا اور قرآن کہتا ہے کہ ہم نے سبا کے مسکن میں بند توڑ سیلاب بھیجا۔ (مسکن سے مراد مرکزی شہر یا سبا کی قوت وشوکت کا مرکز ہے)

جواب: یمن کی جو تاریخ اس علاقے میں دستیاب ہونے والے کتبات کی مدد سے مرتب ہوئی ہے اس میں بہت سی سابق معلومات پر نظرِ ثانی کی گئی ہے۔ قدیم ترین کتبہ جو دستیاب ہوا ہے اس کی تاریخ ۶۶۰ ق م کے مطابق پڑتی ہے۔ اس میں ذکر کیا گیا ہے کہ اس زمانے میں سدِ مارب تعمیر ہو رہا تھا۔ پھر ایک کتبہ شُرَحْبیل بن یَعْفُر نامی بادشاہ کا ملا ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ فلاں تاریخ (مطابق ۴۴۹ء) کو سدّ مارب ٹوٹ گیا، مگر اس کی مرمت کر لی گئی۔

پھر فلاں تاریخ (مطابق ۵۰ ۴ء یا ۴۵۱ء) کو یہ سد بری طرح ٹوٹا جس سے بہت بڑی تباہی آئی اور کثیر آبادی دُور دُور تک منتشر ہوگئی۔ بعد میں بادشاہ نے قبائل حمیر و حضرموت سے مدد لے کر اس کی مرمت کرائی۔ اِس کتبے کی تاریخ ۴۶۵ عیسوی کے مطابق پڑتی ہے۔

یہ کتبہ پہلا تاریخی وثیقہ ہے جس سے سدِ مارب کے ٹوٹنے اور وسیع پیمانے پر تباہی پھیلنے، اور کثیر آبادی کے منتشر ہوجانے کا ثبوت ملتا ہے۔

عرب مؤرخین کا بیان ہے کہ سدِ مارب کی تباہی کے باعث جو قبائل شمالی اور وسطی عرب میں پھیل گئے وہ آل جَفْنَہ (غسّان، اَوس اور خزرج) لَخم، تَنُوخ، طے اور کِندہ وغیرہ تھے۔

حمزہ اصفہانی نے تاریخ سِنی ملوک الارض والانبیاء میں بیان کیا ہے کہ غسانیوں کے سردار جَفْنَہ بن عَمْرو مُزَیقیا کو رومی قیصر نسطورس کے زمانے میں شامی عربوں کا فرمانروا بنایا گیا۔ اس قیصر کا اصل نام (ANASTASIUS) تھا اور اس کا زمانہ حکومت ۴۹۱ء تا ۵۱۸ء تھا۔ یہ بات بھی اِس کی تائید کرتی ہے کہ غسانیوں کا وطن سے نکلنا پانچویں صدی عیسوی کے وسط کا زمانہ ہے۔

اسی طرح یمن سے نکلنے والے ایک اور قبیلے کی حکومت حِیرہ میں ساسانیوں کے ماتحت قائم ہوئی، اور اس کا زمانہ بھی پانچویں صدی ہی کا ہے۔

اس مسئلہ پر عربی زبان میں عراق کے ڈاکٹر جواد علی کی کتاب تاریخ العرب قبل الاسلام نہایت مستند کتابوں میں سے ہے۔

سوال:۔ تفہیم القرآن (جلد چہارم) کے مطالعہ کے بعد درج ذیل باتیں وضاحت طلب رہ گئی ہیں براہ کرم رہنمائی فرما کر ممنون احسان فرمائیے۔ جزاک اللہ۔

۱۔ سبا آیت ۱۴ ح ۲ صفحہ ۱۹۰ حضرت سلیمان کا مُردہ جسم عصا کے سہارے اتنی مدت کھڑا رہا کہ گھن نے عصا کو کمزور کر دیا اور جنوں کو (اور یقیناً انسانوں کو بھی) ان کے انتقال کا علم نہ ہوا... یہ بات بعید از قیاس ہے۔ اور قرآن اسے کسی معجزے کے ... رپر پیش بھی نہیں کر رہا ہے..... کیا جنوں (اور دیگر عمائد سلطنت) میں اتنی عقل بھی نہ تھی کہ حضرت سلیمان جو بولتے چالتے، کھاتے پیتے، مقدمات کے فیصلے سناتے، فریادیں سُنتے، احکام جاری کرتے، عبادت کرتے، حاجات سے فارغ

ہوتے ہوئے اتنی دیر (بلکہ مدت) سے، ساکت وصامت کیوں کھڑے ہیں؟ کیا زندگی کے ثبوت کے لیے صرف کھڑا رہنا کافی ہے؟ اور پھر آپ کے اہل وعیال؟ کیا انہیں بھی انتقال کا پتہ نہیں چلا (جو ناممکن ہے) یا انہی نے یہ ایک ترکیب نکالی تھی؟

مفسر محترم نے جس بات کو صاف اور صریح فرمایا ہے وہ خود ایک پہیلی ہے۔

۲۔ سورۂ احقاف آیت ۲۹ حاشیہ ۳۵۔ جِنّ کی دور ہی میں ایمان لے آئے تھے لیکن انہوں نے رسول اللہؐ اور مسلمانوں کے دورِ مصائب میں کسی طرح کی کوئی مدد نہیں کی، نہ اس کے بعد کسی جہاد میں حصہ لیا۔ کیا سارا قرآن (اوامر و نواہی) جس طرح انسانوں کے لیے واجب الاطاعت ہے جنوں کے لیے بھی اسی طرح اس پر عمل لازم نہیں؟ کیا صلوٰۃ، صوم، زکوٰۃ اور جہاد (بالمال و بالنفس) جنوں پر بھی فرض نہیں؟ اگر فرض نہیں تو استثنا کی بنیاد کیا ہے؟ اور اگر فرض ہے تو جنوں نے کب اور کیسے ان پر عمل کیا؟

(ب) اس سورہ سے پتہ چلتا ہے کہ جنّ اتفاقی طور پر ایمان لے آئے اور انہوں نے اپنے طور پر اپنے ساتھیوں کو اسلام کی دعوت دی...... اگر حضورؐ انسانوں کی طرح جنوں کے لیے بھی مبعوث تھے تو آپ نے جنوں کو خود دعوت کیوں نہ دی؟ ان کی دینی تربیت کے لیے کیا اہتمام اور کیا انتظام فرمایا؟ اور ان کے لیے شرعی احکام کی نوعیت کیا ہے؟ قرآن مجید کی معاشرتی تعلیمات جنوں کے لیے بھی اسی طرح سے واجب ہیں جیسے انسانوں کے لیے یا ان کے احکام مختلف ہیں؟

۳۔ ص ج ۳۶ صفحہ ۳۳۷، قوی سند کے باوجود حدیث مشتبہ ہو سکتی ہے (اور ہے) تو حدیث کی صحت کا معیار کیا رہا؟ صرف عقل سلیم؟ اگرچہ چند واقعات ہی سہی۔

۴۔ شوریٰ آیت ۲۳ ج ۴ صفحہ ۵۰۱ مفسر محترم نے اپنی رائے محفوظ رکھی ہے۔ "قربیٰ" کے سلسلے میں واضح فیصلہ ضروری تھا۔ ایک طبقہ کی تفریق کی اصل بنیاد یہی ہے۔

۵۔ صفحہ ۲۸۹ (طبع اول) آیت ۶۵ صافات ج ۳۶ .... تشبیہ دینے والے (خدا) کے لیے تو تشبیہ کے دونوں ارکان (مُشبَّہ و مُشبَّہ بہٖ) مشہود ہیں۔ رہے انسان، تو انہوں نے شیطان کے سر نہیں دیکھے تو زقّوم کے شگوفے تو دیکھ رکھے ہیں۔ مُشبَّہ بہٖ کی مناسبت سے مُشبَّہ کے متعلق کچھ نہ کچھ تصور قائم کیا جا سکتا ہے... لہٰذا اسے "تخییلی تشبیہ" قرار دینا موزوں نظر نہیں آتا.... اس سلسلے میں جو مثالیں مفسر

محترم نے پیش کی ہیں وہ اس لیے غیر متعلق ہیں کہ ان کے بیان کرنے والے انسان ہیں جنہوں نے واقعی ان چیزوں کو نہیں دیکھ رکھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے تو شیطان اور اس کا سر دیکھ رکھا ہے۔

۶۔ درست مثال کیا ہے؟ اندھیر نگری چوپٹ راج کہ چوپٹ راجہ؟ (صفحہ ۱۷۴)

۷۔ "سخت برافروختہ ہوا اور اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا (ص ۱۸۳) برافروختہ یعنی بھڑک اٹھنا، غصے میں آنا ہے یا شرمندہ یا خوف زدہ ہونا؟

جواب:۔ قرآن مجید میں جو بات جس طرح لکھی گئی ہے میں نے اسی طرح اس کو بیان کر دیا ہے۔ اس پر جو سوالات آپ نے اٹھائے ہیں ان کا جواب قرآن مجید میں موجود نہیں ہے اور میں اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ کر قرآن مجید میں داخل نہیں کر سکتا۔

جنوں کے ایمان لانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسانوں کے درمیان کفر و ایمان کی کشمکش میں وہ شریک ہوں۔ خود ان کے اندر بھی کافر اور مومن جنوں کے درمیان کشمکش ہے اور اس میں انسان حصہ نہیں لیتے۔

جن اتفاقی طور پر ہی ایمان نہیں لائے تھے۔ انسانوں میں جو انبیاء آئے ہیں ان پر ایمان لانے کے جن بھی مکلّف ہیں۔ البتہ یہ تفصیل ہمیں نہیں معلوم کہ ان کے لیے شرعی احکام کیا تھے اور ان کی تربیت کا کیا انتظام تھا۔

قوی سند کے باوجود حدیث کے متن میں کوئی ایسی بات ہو سکتی ہے جو اس کی صحت کے بارے میں شبہہ پیدا کرنے والی ہو۔

سورۂ شوریٰ آیت ۲۳ کی تشریح میں نے اپنی حد تک تو پوری وضاحت سے کر دی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سے آپ کو اطمینان نہ ہوا ہو۔

اگر آپ اس بات پر مطمئن ہیں کہ شیطان کے سر زَقُّوم جیسے ہی ہیں اور انہی سے زَقُّوم کو تشبیہ دی گئی ہے تو آپ یہ تفسیر کر سکتے ہیں۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اردو میں محاورہ کے طور پر اندھیر نگری چوپٹ راجہ ہی بولا جاتا ہے۔

رَبَا الرَّجُلُ رَبْوَۃً کا مطلب سانس پھولنا بھی ہے، اور خجالت میں مبتلا ہونا بھی۔ لیکن میں نے حضرت ابن عباس کے اس فقرے کو ملحوظ رکھ کر ترجمہ کیا ہے کہ بندۂ خدا اگر تجھے تصویر ہی بنانی ہے تو درختوں کی بنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس شخص کو تصویر کی حرمت کا حکم ناگوار ہوا تھا اور وہ مصوری پر اصرار کرنا چاہتا تھا۔

مطبوعات

POLITICAL CONCEPTS IN THE QUR'AN

قرآن میں سیاسی تصورات

مصنّف : پروفیسر قمرالدین خاں صاحب۔
ناشر : انسٹیٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز کراچی۔
صفحات : ۷۶ قیمت : -/۱۲ روپے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا تھا جس کی مثال پیش کرنے سے تاریخ قاصر ہے۔ یہ معاشرہ ایک مثالی معاشرہ تھا۔ اور اپنے مخصوص معاشرتی اصول و اقدار، اقتصادی قوانین و ضوابط اور سیاسی نظریات رکھتا تھا۔ مسلمانوں نے ہر دور میں اس معاشرے کو روشنی کا مینار سمجھا ہے۔ اور اپنی اجتماعی زندگی کے نقش و نگار سنوارنے کے لیے ہر عہد میں اسے ہی پیشِ نظر رکھا ہے۔ لیکن آج مسلمانوں میں ایسے دانشور اور مفکر بھی پیدا ہونے لگے ہیں جو اپنی تمام تر صلاحیتیں یہ باور کرانے میں صرف کر رہے ہیں کہ اسلام محض چند اخلاقی تعلیمات کا ایک مجموعہ ہے اور اس کا دامن معاشرتی اصولوں، اقتصادی ضابطوں اور سیاسی ڈھانچوں سے بالکل تہی ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب اسی تحریک کی ایک کڑی ہے۔ دین و دنیا کی تفریق کا جو نظریہ عیسائیت اور دوسرے مذاہب کا طرۂ امتیاز تھا، یہ کتاب اسی کی صدائے بازگشت ہے۔

کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ جن کے عنوان ہیں (۱) تصورِ ریاست (۲) قرآن میں سیاسی اصطلاحات، (۳) تصورِ اقتدارِ اعلیٰ (۴) قانون سازی (۵) عدالتی شقیں (۶) جنگ اور امن (۷) مالیاتی انتظامات۔ آخر میں "نتیجہ" کے زیرِ عنوان تمام مباحث کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کے تمام مباحث کا مرکزی تخیل ایک ہی ہے کہ قرآن کوئی سیاسی نظریہ پیش نہیں کرتا ہے۔ قرآنِ مجید نہ تصورِ ریاست اور نظریۂ اقتدارِ اعلیٰ سے بحث کرتا ہے اور نہ اس میں قانون کا تصور اور قانون سازی کے اصول و مبادی ملتے ہیں۔ قرآن مجید نہ کوئی مالیاتی نظام پیش کرتا ہے اور نہ عدالتی ڈھانچہ۔ قرآن کے بعض الفاظ سے جو سیاسی تصورات کشید کیے گئے ہیں وہ چند "سیاسی مہم جو لوگوں" کی ذہنی اپج ہے۔ ساری کتاب میں قرآنِ مجید کی

سیدھی سادھی تعلیمات کو مسخ کیا گیا ہے اور بعض مقامات پر تاریخی حقائق کو چھپانے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ کتاب کے تمام مباحث پر تفصیلی محاکمہ مشکل ہے۔ صرف مشتے از خروارے کے طور پر چند باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس سے ساری کتاب اپنی روح کے ساتھ قاری کی نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

مغربی مفکرین کی رائے میں ریاست ایک ایسا معاشرہ ہے جو مخصوص رقبہ رکھتا ہو اور امن و امان اور انصاف کے لیے اپنے پاس قوت نافذہ بھی رکھے۔ قرآن میں چونکہ ریاست کی کوئی ایسی فلسفیانہ تعریف نہیں ملتی ہے اس لیے فاضل مؤلف کے نزدیک قرآن مجید سرے سے اسلامی ریاست کا کوئی تصور ہی پیش نہیں کرتا۔ (ص۱) وہ مزید فرماتے ہیں کہ "جس معاشرتی ماحول میں قرآن مجید کا نزول ہوا اس وقت عرب میں کسی ریاست کا وجود نہ تھا۔ اس وجہ سے اہلِ عرب ریاست، حکومت، قوم، قانون اور عدلیہ کے تصورات سے بالکل ناآشنا تھے۔ لہٰذا ان سیاسی اصطلاحات کی زبان میں ان سے خطاب کرنا ان کے فہم سے بالاتر ہوتا۔" (ص۵) ہمارے نزدیک پروفیسر صاحب کا طرزِ استدلال دو وجوہ سے غلط اور خلافِ حقیقت ہے۔ اولاً قرآنِ مجید دور از کار فلسفیانہ مباحث کی کتاب نہیں ہے، بلکہ کتاب ہدایت ہے۔ جو لوگوں کو نظری بحثوں میں اُلجھانے بغیر عمل اور اصلاح پر اُبھارتی ہے۔ لہٰذا اگر قرآنِ مجید میں ریاست کی کوئی اصطلاحی تعریف موجود نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن مجید مسلمانوں کو اپنے سیاسی اداروں کی تعمیر کی کوئی اساس مہیا نہیں کرتا۔ ثانیاً تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ اہل عرب کے تجارتی قافلے اکثر شام، مصر، عراق وغیرہ میں آتے جاتے رہتے تھے۔ اور وہ ان عظیم الشان ریاستوں سے بخوبی واقف تھے۔ پھر یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ بالکل ابتدائی دور میں جب مسلمانوں پر کفارِ مکہ کا ظلم و ستم حد سے بڑھ گیا تو مسلمان حبشہ کی عیسائی ریاست میں ہجرت کر گئے تھے۔ اور کفار ان کے تعاقب میں والیٔ ریاست نجاشی تک جا پہنچے تھے۔ اس طرح مسلمان اور کفار دونوں فریق اپنی آنکھوں سے ایک باقاعدہ اور منظم ریاست کا مشاہدہ کر چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید میں ایک معلوم و معروف چیز پر کلام کرنا پسند نہیں فرمایا گیا کیونکہ یہی ایجاز و اختصار قرآن کا اعجاز ہے۔

تصورِ ریاست پر گفتگو کرتے ہوئے ایک مقام پر پروفیسر صاحب رقمطراز ہیں۔ "قرآن اس بات کا قائل نہیں ہے کہ سیاسی قوت واقتدار لوگوں کے ضمیر کی تشکیل کر سکتا ہے۔ یا اس پر حکمرانی کر سکتا ہے بلکہ سیاسی قوت اکثر ظلم و استبداد اور تباہی کا سبب بنتی ہے۔" (ص۳) اس میں شبہ نہیں ہے کہ خارجی دباؤ سے انسان کے ذہن و قلب کو متاثر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس امر سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ناپسندیدہ افراد کی ناپسندیدہ

سرگرمیوں کو روکنے کے لیے طاقت کا استعمال ضروری ہے ۔ کیا کوئی اشتراکی ملک اپنے افراد کو اشتراکی فلسفہ اور نظریہ کے خلاف بات کرنے اور اشتراکی نظام کو زیر و زبر کرنے کی اجازت دیتا ہے ؟ اسی طرح کیا کوئی جمہوری ریاست لوگوں کو جمہوری اداروں کی بیخ کنی کرنے کی آزادی دے سکتی ہے ۔ اسلام جس سیاسی قوت کا طلب گار ہے اس کا مقصدِ وحید بھی یہی ہے کہ کم از کم اس قوت کے ذریعہ سے ایسے تخریب پسند عناصر کو پنپنے نہ دیا جائے جو اسلام کے بنیادی عقیدوں اور اس کے قائم کردہ اداروں کو تہ و بالا کر دیں ۔ فاضل پروفیسر صاحب کا اگر یہ نقطۂ نظر بھی صحیح سمجھ لیا جائے کہ اقتدار اکثر ظلم و استحصال اور تباہی و بربادی کا ذریعہ بنتا ہے تو اس سے ہر فرد پر واجب ہو جاتا ہے کہ قوت و اقتدار کے تمام مظاہر کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دے ۔ اور اقتدار کی مسند بچھنے کی اجازت ہی نہ دے تاکہ انسانیت اس سیاسی قوت کے ظلم و استبداد کے پنجہ سے گلو خلاصی کر سکے ۔ پروفیسر صاحب کیا اقتدار دشمنی کی کوئی ایسی تحریک چلانا پسند کریں گے ؟ یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف سیاسی قوت کو ہلاکت و بربادی اور تمام برائیوں کا سرچشمہ قرار دیا جا رہا ہے ۔ لیکن دوسری طرف بڑی شدّ و مدّ کے ساتھ یہ وعظ بھی کیا جا رہا ہے کہ مذہب کو سیاسی اقتدار سے کوئی سروکار نہیں ہے ۔ اس لیے ایک مسلمان کو اربابِ اقتدار کو کبھی چیلنج نہیں کرنا چاہیے ۔

زیرِ تبصرہ کتاب کا سب سے خطرناک حصہ وہ ہے جس میں انبیاء علیہم السّلام کے مقصدِ بعثت پر بحث کی گئی ہے ۔ پروفیسر صاحب کے نقطۂ نظر کے مطابق (جو ان کے خیال میں خالص قرآنی نقطۂ نظر ہے) "انبیاء لوگوں کو صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی کی طرف دعوت دینے آئے تھے ۔ حضرت نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰ، عیسیٰ علیہم السّلام صرف اخلاق کے معلّم تھے ۔ اصحابِ اختیار نہ تھے ۔ ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ وہ ایک اسلامی ریاست کے قیام کے لیے مبعوث کیے گئے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے اقتدار کو چیلنج نہیں کیا" (ص ۱۳) نیز "پیغمبر ایک عام شہری ہوتا ہے ان کو سیاست سے کوئی سروکار نہیں ہوتا" (ص ۱۳) قرآنِ مجید اس نظریہ کو بھی باطل ٹھہراتا ہے ۔ قرآن کے مطابق ہر نبی کی بعثت کی غرض یہ تھی کہ لوگ اس کی اتباع کریں ۔ اور اس کی اطاعت بجا لائیں ۔ یہ چیز باطل نظام کے خلاف بغاوت نہیں تو اور کیا ہے ۔ حضرت ابراہیم اور موسیٰ علیہم السلام نے نمرود و فرعون کو توحید و رسالت کی جو دعوت دی تھی اسے اگر وہ قبول کر لیتے تو انہیں اپنے اقتدار سے دست بردار ہونا پڑتا ۔ کیونکہ وہ حضرت ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کی اطاعت کے پابند ٹھہرتے ۔ اور اقتدارِ اعلیٰ ان اولوالعزم پیغمبروں کی طرف منتقل ہو جاتا ۔ کیونکہ اقتدارِ اعلیٰ کہتے ہی اس کو ہیں جس کی سب سے بڑھ کر اطاعت کی جائے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان اربابِ اقتدار

نے انبیاء کی دعوتِ توحید و رسالت کو بے ضرر اصلاحی اور اخلاقی تعلیمات سمجھ کر نہ صرف یہ کہ اس کی سرپرستی نہیں کی بلکہ اس دعوت کے مضمرات سے ادنیٰ چشم پوشی بھی گوارا نہ کی - اس کے برعکس اپنے تمام مادی وسائل سے ان حضرات کی دعوت کو ناکام بنانے کی کوشش کی - فرعون نے تو موسیٰ علیہ السلام کی دعوت سن کر ساری قلمرو میں خطرے کی گھنٹی بجادی کہ یہ شخص ہمارا اقتدار چھیننا چاہتا ہے - لیکن افسوس کہ فاضل پروفیسر صاحب انبیاء کی دعوت کے ان مضمرات کا ادراک نہیں کر سکے -

آج جب کہ ہر گروہ اپنے مخصوص نظریات کی ترویج و تنفیذ کے لیے سیاسی قوت و اقتدار کا حصول ضروری سمجھتا ہے - اور اشتراکی، سرمایہ پرست، جمہوریت پسند اور بے دین قوتیں اقتدار کو حاصل کرنے کی غرض سے سرگرمِ عمل ہیں، مسلمانوں کو افیون کے یہ ٹیکے لگائے جارہے ہیں کہ وہ اس کشمکشِ حیات سے بے تعلق رہیں - اور ایک غلام بے دام کی طرح ہر بے خدا اشتراکی اور ہر خدا بیزار سرمایہ پرست اور جمہوریت نواز کی چاکری پر کمربستہ ہو جائیں - دیکھیے پیرایۂ وعظ کتنا موثر ہے " بھارت، سری لنکا، روس، برما، تھائی لینڈ، فلپائن اور افریقہ کے بہت سے ممالک میں مسلمان کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں - اگر انہوں نے کوئی اسلامی ریاست قائم کرنے کی کوشش کی تو ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے گا" (ص۴۳) -

اسلام ایک "کیشِ مرداں" ہے لیکن پروفیسر صاحب نے اس کو "مذہبِ گوسفنداں" بنا کر پیش کیا ہے - اسلام شہادت گہِ اُلفت ہے - اور گامِ اولین پر سر کا نذرانہ پیش کرنا پڑتا ہے - یہ وادیٔ عشق ہے اور یہاں آبلہ پائی کا مرحلہ ناگزیر ہے - اگر آبلہ پائی کا یارا نہیں تو کس حکیم نے کہا ہے کہ وادیٔ عشق میں قدم رکھا جائے -

ہماری رائے میں مؤلف نے یہ کتاب تالیف فرما کر خداداد صلاحیتوں اور قوتوں کا صحیح مصرف تلاش نہیں کیا اور اس کتاب کی اشاعت پر جو زرِ کثیر صرف ہوا ہے اسے ضیاعِ محض کے نام ہی سے موسوم کیا جاسکتا ہے -

---

زمزمۂ دل (نعت و منقبت)

نتیجۂ فکر: حکیم سرو سہارنپوری

شائع کردہ: مکتبہ نمود منزل - جی ۲۰۵ غازی صلاح الدین ایوبی روڈ - راولپنڈی -

ضخامت: ۱۱۰ صفحات قیمت: ۶/- روپے

پانچ قصائد اور بارہ نعتیہ غزلوں کا یہ مجموعہ حکیم سرو سہارنپوری کے خلوص اور قدرتِ کلام کا ایک قابلِ قدر نمونہ ہے - قصیدہ کی بٹی ہوئی صنفِ سخن کو انہوں نے سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے اور اسے نبھانے کی حتی المقدور

کوشش کی ہے۔ قصیدہ گویوں کی روایتی بے اعتدالیوں سے ان کا کلام پاک ہے۔ قصیدہ" رحمۃ اللعالمین" سے پہلے مشہور نعتیہ قطعہ" بلغ العلیٰ بکمالہ۔ کشف الدجیٰ بجمالہ" کا منظوم اُردو ترجمہ سرو صاحب کی مہارتِ فن کی دلیل ہے۔

سرو صاحب کے کلام کی ایک نمایاں خوبی سلاستِ زبان و روانیٔ بیان ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے قصیدہ کی روایتی ہیئت کا پورا پورا اہتمام کیا ہے۔ تشبیبوں میں گریز کے مقامات سے بڑی خوبصورتی سے گذرے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

منہ ڈھانپے ہوئے جاتی ہے تاروں کی ادا سے دیکھے تو کوئی رات کا اُترا ہوا چہرہ

(رحمۃ اللعالمینؐ)

گلشن میں کوئی سرو قد آنے کو ہے اے دل شمشاد و صنوبر ہیں پئے تعظیم ہوئے خم

(صدیق اکبرؓ)

خود حُسنِ ازل آئینہ بردار ہوا ہے بے پردہ ہوا کس کا رُخِ آئینہ سیما

(فاروق اعظمؓ)

آخر کوئی باعث تو ہے پھولوں کی حیا کا شاید کہ لبِ سرو پہ ہے مدحتِ عثمان

(عثمان غنیؓ)

صـ۵۳ پر اس شعر میں " ازل سے " کے بجائے " ابد تک " ہونا چاہیے تھا ؎

آئینۂ قسمت میں ازل سے ترے سر ہے قرآن کی نگہداشت، تراویح کا سہرا

صـ۸۵ پر " بہتا ہے سمندر" کا ٹکڑا خلاف عادت ہے۔ سمندر بہتا نہیں ہے، اُمنڈتا ہے، موجزن یا متلاطم ہوتا ہے۔ صـ۹۶ پر ایک مصرعہ ہے ؎ حدِ حیات میں ہے شورِ کن فکاں تجھ سے" ۔ یہاں " حد" کے دال کو مشدد ہونا تھا اور مصرعہ یوں موزوں ہو سکتا تھا ؎

جہانِ زیست میں ہے شورِ کن فکاں تجھ سے

" زمزمۂ دل" نعت و منقبت کے مجموعوں میں انشاء اللہ امتیازی مقام حاصل کرے گا۔ دیدہ زیب اور معنی خیز گرد پوش کے ساتھ کتاب کی عمدہ طباعت اس کے معنوی حُسن کو دوبالا کرتی ہے۔

(بقیہ اشارات) استعمال میں لاتا ہے گویا کہ وہ خدا کے حضور میں کھڑا ایک ایک پائی کا حساب چکا رہا ہے۔ اس کا سر تاج سے مزین ہونے کے بعد غرور سے اونچا نہیں ہوتا بلکہ خدا کی بارگاہ میں جھکتا ہے۔ پھر تختِ اقتدار پر متمکن ہونے کے بعد اس کی شان و شوکت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر اپنی عظیم ذمہ داریوں کا احساس بڑھ جانے کی وجہ سے فروتنی پیدا ہوتی ہے کہ نہ معلوم آخرت میں اس سے کس طرح کی باز پرس ہونے والی ہے۔

ایک مسلمان "شاہی میں فقیری" کی غیر معمولی قدر و قیمت کو اچھی طرح جاننے کے باوجود عملی اعتبار سے دوسرے مسلک یعنی "فقیری میں بھی شاہی" کو محض اس بنا پر اختیار کرنا پسند کرتا ہے کہ وہ پہلے مسلک کے مقابلے میں کہیں زیادہ سہل اور آسان ہے۔ وہ اپنے دل کو اس طرح سمجھاتا ہے کہ اس کے لیے تو اپنی ذاتی ذمہ داریاں ناقابلِ برداشت بوجھ بنی ہوئی ہیں وہ اجتماعی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتا ہے؟ بسا اوقات وہ اس بات کا بڑے شد و مد سے پرچار بھی کرتا ہے اور سیاست، جو اجتماعی ذمہ داریوں سے متعلق حیاتِ انسانی کا ایک نہایت اہم شعبہ ہے، کو ناپاک کھیل گردان کر بڑے متغرورانہ انداز میں اس سے دامن کش رہنے کا وعظ سناتا ہے۔

ممکن ہے ماضی میں جب اجتماعی زندگی کا دائرہ بہت ہی محدود تھا، کوئی مردِ درویش اس ناپاک کھیل سے یکسر الگ رہ کر اپنی روح کو پاکیزہ رکھنے میں کامیاب ہوا ہو، مگر دورِ جدید میں جو لوگ اس طرح کی باتیں کر کے اپنے غلط طرزِ عمل کو روحانی اور اخلاقی اعتبار سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ یا تو فریبِ نفس کا شکار ہیں یا غرورِ نفس کے مہلک مرض میں مبتلا ہیں یا وہ عہدِ حاضر کی اجتماعی جکڑ بندیوں کے جابرانہ مزاج اور ان کی نوعیتوں سے یکسر ناواقف ہیں۔ یہ لوگ سیاست کو تو ناپاک کھیل کہہ کر عوام کو اس سے الگ رہنے کا مشورہ دیتے ہیں لیکن وہ اجتماعی زندگی کی ان سرگرمیوں سے جو اس کھیل سے زیادہ ناپاک اور ایمان سوز ہیں کیوں الگ نہیں رہتے۔ دورِ حاضر کا کونسا تاجر ایسا ہے جو اس بات سے ناواقف ہے کہ ملکی معیشت میں سود اس طرح گردش کرتا ہے جس طرح انسانی جسم کے اندر خون۔ پھر حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس برائی کی جن شدید الفاظ میں مذمت کی ہے وہ بھی سب پر عیاں ہے۔ لیکن ان حقائق کو جاننے کے باوجود آج تک کسی خدا ترس تاجر کو یہ توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ محض اس بنا پر اپنے کاروبار کی بساط لپیٹ

دے کہ اس میں سود کے اجزا شامل ہیں۔ اس متضاد طرز عمل کا آخر اس کے علاوہ اور کیا سبب ہے کہ کاروبار اور تجارت سے فرد یا چند افراد کی ذات کو نفع حاصل ہوتا ہے اس لیے دولت سمیٹنے کے اس ناپاک فعل سے نہ تو وہ خود دست کش ہوتے ہیں نہ دوسروں کو دست کش ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ البتہ کار زارِ حیات سے الگ رہ کر خدا کی رضا جوئی کے غلط فلسفہ کی سیاسی زندگی کے دائرہ میں خوب اشاعت کی جاتی ہے۔ وہ غالباً اس لیے کہ سیاست کے خارزار میں قدم رکھنے کا ان میں حوصلہ اور جرأت نہیں ہوتی۔

(بقیہ اسلام میں انسانی حقوق)

روشن خیالی کی مدعی دنیا آج تک ان سے زیادہ منصفانہ "قوانین" نہیں بنا سکی ہے، تو دوسری طرف یہ دیکھ کر دل پر ایک چوٹ لگتی ہے کہ ہم وہ بدقسمت لوگ ہیں جن کے پاس اتنا بلند پایہ قانون موجود ہے اور پھر بھی ہم ہدایت کے لیے اُن رہنماؤں کی طرف رجوع کرتے ہیں جن کے تصور میں بھی حق اور عدل کی یہ بلندیاں کبھی نہیں آئی ہیں۔ اور اس سے بھی بڑھ کر رنج یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ اسلام کو ماننے کا دعویٰ کرنے والے حکمران آج دنیا بھر میں اپنے خدا اور اپنے رسول کی نافرمانی پر اپنی حکومت کی بنیاد رکھے ہوئے ہیں۔

تبلیغِ دین کے لیے

۲۰

مختصر کتب کا جامع سیٹ ۲

	روپے
۱- اسلام اور جاہلیت	۱/۲۵
۲- سرورِ عالم	۱/۱۰ ”
۳- اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	۱/۲۵ ”
۴- عصرِ حاضر میں اسلام کی زبوں حالی	۱/۲۵ ”
۵- ہمارے داخلی و خارجی مسائل	۱/۴۰ ”
۶- مسلم خواتین سے اسلام کے مطالبات	۱/- ”
۷- سیاست ایک دینی تقاضا	۱/۴۰ ”
۸- اسلام کی اقتصادی پالیسی	۱/- ”
۹- انسان کا معاشی مسئلہ	۱/۴۰ ”
۱۰- اسلام اور عدلِ اجتماعی	-/۹۰ ”
۱۱- بیمۂ زندگی	۱/-
۱۲- اپنی اصلاح آپ	۱/۱۰ ”
۱۳- فرعون و کلیم کی داستانِ کشمکش	۱/- ”
۱۴- دین یا لادینیت	۱/۹۰ ”
۱۵- تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں	۱/۷۵ ”
۱۶- مسئلہ تعدادِ ازواج	۱/- ”
۱۷- شہادتِ امام حسینؓ	-/۸۰ ”
۱۸- پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کی تدابیر	۱/۷۵ ”
۱۹- مولانا مودودی پر اعتراضات کی حقیقت	۱/۳۰ ”
۲۰- عالمِ اسلام کی تعمیر میں طلباء کا کردار	۱/- ”

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ - ۱۳- ای - شاہ عالم مارکٹ لاہور
فون:- ۶۸۳۴۱

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

ترجمۂ قرآن مجید

مع مختصر حواشی

از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

اس میں مصنف نے قرآن حکیم کے متن اور تفہیم القرآن کے ترجمے کے ساتھ بہت مختصر حواشی درج کر دیے ہیں تاکہ عام لوگ جو قرآن مجید کا سیدھا سادھا مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں وہ ایک ہی جلد میں تفہیم القرآن کے خلاصے سے فائدہ اٹھا سکیں

انشاء اللہ مارچ ۷۶ء کے پہلے ہفتے میں

یہ قرآن مجید شائع ہو جائے گا

جو حضرات پیشگی روپے روانہ کر دیں گے انہیں یہ مترجم و محشّٰی قرآن مجید رقوم کی ترسیل کے مطابق ترتیب وار بھیجا جائے گا

هدیہ قسم اعلیٰ ۷۵/- روپے

هدیہ قسم دوم ۶۰/- روپے

پیشگی رقم ارسال کرنے والے حضرات سے محصول ڈاک نہیں لیا جائے گا

ناظم ادارۂ ترجمان القرآن۔ اچھرہ۔ لاہور

فون نمبر: ۴۱۱۰۱۶ — ۴۱۲۰۱۷